وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا

بیاد : سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

جون ۲۰۱۱ء

ماہنامہ

عالمی ترجمان القرآن

مدیر : پروفیسر خورشید احمد

الابلاغ ٹرسٹ

ماہنامہ
عالمی ترجمان القرآن

جلد ۱، عدد ۲، رجب ۱۴۳۲ھ، جون ۲۰۱۱ء

مدیر: پروفیسر خورشید احمد
نائب مدیر: مسلم سجاد

ادارتی امور: منصورہ، ملتان روڈ، لاہور - ۵۴۷۹۰ فون: ۳۵۴۲۵۳۵۶-۰۴۲ فیکس: ۳۵۴۳۲۱۹۴ ای میل: tarjuman@wol.net.pk

انتظامی امور: ۶- صابر سٹریٹ، ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور - ۵۴۶۰۰ فون: ۳۷۵۸۷۹۱۶-۰۴۲ فیکس: ۳۷۵۸۵۵۹۰-۰۴۲

موبائل: ۴۱۱۲۷۰۰-۰۳۰۷ ای میل: tarjuman@tarjumanulquran.org ویب: www.tarjumanulquran.org

• قیمت فی شمارہ: ۳۰ روپے • زرسالانہ: ۳۰۰ روپے • ۵ سال کے لیے: ۱۲۰۰ روپے • معاون خصوصی: ۵۰۰۰ روپے

• بنگلہ دیش، بھارت ۱۲۰۰ روپے • ایران، مشرق وسطیٰ، مشرق بعید، یورپ، افریقہ ۱۵۰۰ روپے • امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا ۱۸۰۰ روپے

زیراہتمام: الابلاغ ٹرسٹ

حرکت کا مقابلہ حرکت سے

کوئی تہذیبی و تمدنی حرکت جمود کی چٹانوں سے نہیں روکی جاسکتی۔ اس کو اگر روک سکتی ہے تو ایک مقابل کی تہذیبی و تمدنی حرکت ہی روک سکتی ہے۔ ہمارے ہاں اب تک سیلابوں کا مقابلہ چٹانیں کرتی رہی ہیں۔ اسی لیے ہمارے ملک سمیت قریب قریب تمام مسلمان ملک مغرب کے فکری و تہذیبی سیلابوں میں غرق ہوتے چلے گئے ہیں۔ اب ہم حرکت کا مقابلہ حرکت سے اور سیلاب کا مقابلہ جوابی سیلاب سے کر رہے ہیں.... ہماری تحریک کسی ایک گوشے یا ایک میدان میں ان ضلالتوں کا مقابلہ نہیں کر رہی ہے بلکہ ہر میدان میں ہمارا اور ان کا تصادم ہے۔ ہم نے ان کے تمام نظریات اور عملی طریقوں پر تنقید کی ہے اور ان کی کمزوریاں کھول کھول کر سامنے رکھ دی ہیں۔ ہم نے ہر مسئلۂ زندگی کا حل ان کے حل کے جواب میں پیش کیا ہے اور دلائل سے اس کو معقول ثابت کر دیا ہے۔ ہم ان کے ادب کے مقابلے میں ایک صالح ادب لائے ہیں، ان کے فلسفے کے مقابلے میں ایک بہتر فلسفہ لائے ہیں، ان کی سیاست کے مقابلے میں ایک زیادہ مضبوط سیاست لائے ہیں، اور ہماری صفوں میں ان کا مقابلہ کرنے کے لیے صرف قال اللہ و قال الرسول جاننے والے ہی نہیں ہیں بلکہ اس کے ساتھ قال ہیگل وقال مارکس وقال فرائڈ بھی انھی کے برابر جاننے والے ہیں۔ درس گاہوں میں جہاں ان کی فکر اور تہذیب کی اشاعت کرنے والے موجود ہیں، وہیں انھی کی ٹکّر کے فکری و تہذیبی مبلغ ہماری طرف سے بھی موجود ہیں.... سوسائٹی کے ہر طبقے میں ان کے اثرات کے بالمقابل ہمارے اثرات بھی کم یا زیادہ کارفرما ہیں.... اور ایک طاقت ورراے عام غیر اسلامی افکار و اخلاق و اطوار کے خلاف تیار ہوتی جارہی ہے.... جماعت اسلامی بھی خالی خولی تقریریں اور تحریریں اور اجتماعی سرگرمیاں لیے ہوئے سامنے نہیں آگئی ہے بلکہ وہ انفرادی سیرت اور جماعتی اخلاق بھی ساتھ لائی ہے جو اسلام کی اگر مکمل نہیں تو کم از کم صحیح نمایندگی ضرور کرتا ہے۔ اس کے اثرات جہاں جہاں بھی پہنچ رہے ہیں، وہاں اسلامی خیالات کے ساتھ اسلامی تہذیب اور اسلامی اطوار کا مظاہرہ پورے فخر کے ساتھ سر اُونچا کرتے ہوئے کیا جارہا ہے، اور وہ کیفیت دُور ہو رہی ہے کہ ماڈرن سوسائٹی میں ایک شخص نماز تک پڑھتے ہوئے شرماتا تھا اور ایک خاتون بُرقع اوڑھنے پر لاکھ معذرتیں کر کے بھی ڈرتی تھی کہ نہ معلوم تاریک خیالی کا دھبہ اس کے دامن سے مٹا یا نہیں۔

('اشارات'، سید ابوالاعلیٰ مودودی، ترجمان القرآن، جلد ۳۶، عدد ۲، شعبان ۱۳۷۰ھ، جون ۱۹۵۱ء، ص ۷-۸)

اشارات

دہشت گردی کی تباہ کاریاں

نئی حکمت عملی کی ضرورت

پروفیسر خورشید احمد

قوم ابھی ۲مئی ۲۰۱۱ء کے ایبٹ آباد پر امریکی حملے کے زخموں سے بے حال تھی کہ ۲۲مئی کو پاکستان نیوی کے مہران بیس پر دشمن نے ایک کاری ضرب لگائی، اور پاک بحریہ اپنے دفاع کے ناقابلِ تسخیر ہونے کے تمام دعووں اور نیول بیس پر ۱۱۰۰ محافظوں کی موجودگی کے باوجود چار یا چھے یا ۱۲ سر پھرے نوجوانوں کی ۱۶ گھنٹے پر محیط کارروائی کے نتیجے میں اپنے قیمتی ترین دفاعی اثاثوں سے محروم ہوگئی۔ ۱۲عسکری جوانوں نے اپنی جان کا نذرانہ پیش کیا، ۲۰ سے زیادہ زخمی ہوئے، اور پاکستان کی دفاعی صلاحیت پر قوم کو جو ناز تھا اور دشمن جس سے خوف زدہ تھے، اس کے بارے میں ایسے سوالات اُٹھ کھڑے ہوئے جو دن کا چین اور رات کی نیند حرام کردینے والے ہیں۔

دہشت گردی کے خلاف امریکا کی جنگ میں شرکت کے فیصلے سے اب تک ہماری دفاعی تنصیبات اور اداروں پر ۱۲۱ حملے ہوچکے ہیں جن میں فضائیہ، بری فوج، بحریہ اور آئی ایس آئی کے حساس ترین مقامات پر دشمن نے کارروائیاں کی ہیں اور 'دہشت گردی کی کمر توڑ دینے' کے بار بار کے دعووں کے باوجود دہشت گردی کی کارروائیوں میں کوئی کمی واقع نہیں ہورہی ہے بلکہ کمیت اور کیفیت دونوں کے اعتبار سے اضافہ ہی ہوتا نظر آرہا ہے۔ کیا اب بھی وہ وقت نہیں آیا کہ ہماری سیاسی اور عسکری قیادت کی آنکھیں کھلیں اور پورے مسئلے کا ازسرِنو جائزہ لے کر ان ۱۰ برسوں میں جو کچھ ہوا ہے، اس کا بے لاگ تجزیہ کرکے نفع اور نقصان کا مکمل میزانیہ تیار کیا جائے اور آگ اور خون

کے اس جہنم سے نکلنے کے لیے نئی سوچ اور نئی حکمت عملی وضع کی جائے۔

اہلِ نظر اور دانش ور ہر بڑے واقعے کو wake-up call (جاگو! جاگو!!) کہتے ہیں لیکن قیادت ہے کہ امریکا کے طلسم میں مسحور خوابِ غفلت سے بیدار ہونے کو تیار نہیں۔ امریکی ڈرون حملے روز افزوں ہیں۔ بارک اوباما، ہیلری کلنٹن اور امریکا کی عسکری قیادت حتیٰ کہ پاکستان میں امریکا کے سفیر بھی مسلسل اعلان کر رہے ہیں کہ انھیں پاکستان پر اپنے یک طرفہ فوجی ایکشن، ہماری حاکمیت کی پامالی، اور ہمارے شہریوں کی ہلاکت پر نہ صرف کوئی افسوس نہیں اور وہ کسی قسم کی معذرت کے اظہار تک کے لیے تیار نہیں ہیں بلکہ دھڑلے سے کہہ رہے ہیں کہ جو کچھ ماضی میں کیا ہے، پاکستانی عوام کے سارے احتجاج اور امریکا کی مخالفت کے جذبات کے پُرزور اظہار کے باوجود، وہ پھر ویسے ہی حملے کریں گے اور پاکستان کی پارلیمنٹ نے امریکا کی ان جارحانہ کارروائیوں کے خلاف جو متفق علیہ اعلان ایک بار پھر ۱۴ مئی ۲۰۱۱ء کو کیا ہے، اس کی وہ پرِ کاہ کے برابر بھی پروا نہیں کرتے۔ دوسری طرف پاکستان کی سیاسی اور عسکری قیادت کا حال یہ ہے کہ ''ٹک ٹک دیدم، دم نہ کشیدم''، اور اس سے بھی زیادہ پریشان کن رویہ ان صحافیوں، دانش وروں، اینکر پرسنز اور سیاست دانوں کا ہے جو معروضی حقائق، عوام کے جذبات اور پارلیمنٹ کی قراردادوں کو یکسر نظرانداز کرتے ہوئے قوم کو یہ باور کرانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ امریکا کی گرفت سے نکلنے کی کوشش تباہ کن ہوگی___ گویا اس قوم کی آزادی، سالمیت، خودمختاری، عزت اور وقار سب غیر متعلق ہیں اور صرف چند ارب ڈالروں کے لیے ملت اسلامیہ پاکستان نے لاکھوں انسانوں کی قربانی دے کر جو آزادی اور عزت حاصل کی ہے اور ایک ایٹمی طاقت پاور بن کر جو مقام حاصل کیا ہے، اسے چند ٹکوں کی خاطر قربان کر دیا جائے۔ یہ وہ غلامانہ ذہنیت اور تباہ کن مفاد پرستی ہے جس کے بارے میں اقبال نے کہا تھا ؎

تھا جو ناخوب ، بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

فیصلہ کن سوال

آج قوم کے سامنے ایک بار پھر وہی سوال ہے جو برطانوی دورِ غلامی میں اس کے سامنے تھا___ یعنی وقتی مفادات کی پوجا یا آزادی اور عزت کی زندگی کے لیے ازسرِنو جدوجہد، خواہ وہ کیسی

ہی کٹھن کیوں نہ ہو۔ ملت اسلامیہ پاکستان نے جس طرح اُس وقت کے مفاد پرست سیاست دانوں اور عافیت کوشوں کے خوش نما الفاظ ان کے منہ پر دے مارے تھے اور ہر قسم کی قربانیاں دے کر آزادی اور عزت کا راستہ اختیار کیا تھا، آج بھی قوم کو اپنی آزادی اور عزت کی حفاظت کے لیے موجودہ سیاسی بازی گروں اور مفاد پرستوں کے چنگل سے نکل کر پاکستان اور اس کے آزادی اور اسلامی تشخص کی حفاظت کے لیے سردھڑ کی بازی لگانا ہوگی، اس لیے کہ بقول اقبال ؎

یا مُردہ ہے یا نزع کے عالم میں گرفتار
جو فلسفہ لکھا نہ گیا خونِ جگر سے

اگر قوم کو اپنی آزادی اور عزت کی حفاظت کے لیے امریکا کی سامراجی گرفت سے نکلنا ہے ــــ اور حقیقت یہ ہے کہ ہمارے سامنے اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ موجود ہی نہیں ہے ــــ تو اس کے لیے ضروری ہے کہ پوری دیانت داری کے ساتھ ان عوامل کو سمجھا جائے جن کی وجہ سے ہماری آزادی گروی ہوگئی ہے اور ہماری پالیسیاں واشنگٹن کے اشارے پر اور بہت بڑی حد تک صرف امریکا کے مفاد میں وضع کی جارہی ہیں۔

اس نئی غلامی کے گسے شکنجوں کو مضبوط تر کرنے کے لیے معاشی زنجیریں روز افزوں ہیں۔ حکمرانوں کو ان کی کرپشن اور مفاد پرستی کی وجہ سے امریکا نے اپنا آلۂ کار بنالیا ہے۔ اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے امریکی سفارت کاروں، امریکی این جی اوز، امریکی ماہرین اور محاسبوں کی فوج ظفر موج، اور ان کے ساتھ ہماری سرزمین پر امریکی افواج، سی آئی اے کے اہل کار اور مخبر سرگرم ہیں۔ ریمنڈ ڈیوس کے خون آشام ڈرامے نے اس امریکی نیٹ ورک کو بے نقاب کردیا جو ملک کی باگ ڈور کو اپنی مرضی کے مطابق چلا رہا ہے۔ ڈرون حملوں کی روز افزوں بوچھاڑ اور ہماری سرزمین پر امریکی فوجی قدموں کی چاپ، نیز ہر روز واشنگٹن اور کابل سے امریکی سول اور فوجی آقاؤں کی آمدورفت، اس نئے استعماری انتظام کے وہ چند پہلو ہیں جو اب کھل کر سامنے آگئے ہیں۔ ہمارے حکمران خواہ کیسے ہی خوابِ غفلت میں مبتلا ہوں یا اس خطرناک کھیل میں شریک کار ہوں لیکن پاکستانی قوم اب بیدار ہوچکی ہے اور اس کے سامنے اپنی آزادی اور عزت کی حفاظت کے لیے ہر ممکن ذریعے سے اجتماعی جدوجہد کے سوا کوئی راستہ باقی نہیں رہا ہے۔ یہ معرکہ کس طرح

سر کیا جائے، اس پر گفتگو کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ چند حقائق کو ذہنوں میں تازہ کرلیا جائے۔

نیا عالمی خطرناک کھیل

یہ بات اچھی طرح سمجھنے کی ہے کہ امریکا اور یورپی اقوام 'دہشت گردی کے خلاف جنگ' کے نام پر ایک دوسرے ہی ایجنڈے پر کام کر رہی ہیں۔ اصل ایشو دنیا کے، اور خصوصیت سے مسلم اور عرب دنیا کے معدنی، معاشی اور اسٹرے ٹیجک وسائل پر قبضہ اور ان کو اپنے مفاد کے لیے استعمال کرنا ہے۔ نیز اس استحصالی بندوبست کو محفوظ کرنے کے لیے مسلم اور عرب ممالک پر ایسی قیادتوں کو مسلط کرنا اور مسلط رکھنا ہے جو امریکا کے آلۂ کار کی حیثیت سے خدمات انجام دے سکیں۔ اس سلسلے میں سیاسی اور عسکری قیادتوں کے ساتھ لبرل دانش وروں، صحافیوں اور سول سوسائٹی کے اداروں کا استعمال ان کی حکمت عملی کا مرکزی حصہ ہے۔ معاشی طور پر ان ممالک کو اپنی گرفت میں رکھنے کے لیے قرضوں کا جال بچھایا گیا ہے اور ان ممالک کو عالم گیریت (globalization) کے نام پر مغربی اقوام اور اداروں کی محتاجی (dependence) کی زنجیروں میں جکڑ دیا گیا ہے۔ آخری حربے کے طور پر امریکی افواج کو، جو تباہ کن ٹکنالوجی سے آراستہ ہیں، استعمال کیا جا رہا ہے۔ آج دنیا میں ۸۰ سے زائد مقامات پر امریکی فوجی اڈے موجود ہیں۔ افغانستان اور عراق کی جنگ اور عالمِ عرب کے قلب میں اسرائیل کی کیل کانٹے سے لیس افواج اور خفیہ تنظیموں کا کردار اس گیم پلان کا حصہ ہے۔

امریکی سرمایہ دارانہ نظام کے بقا اور ترقی کے لیے جنگ، جنگی امداد اور تجارت ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں اور اس کی پالیسی پر عمل کا مؤثر ترین ذریعہ ہیں۔ اس گریٹ گیم کو سب سے بڑا خطرہ مسلمان عوام، ان کے دینی شعور اور اُمت مسلمہ کے جذبۂ جہاد سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ جنگ عسکری قوتوں سے لڑی جا رہی ہے اور جس ملک سے مزاحمت کا خطرہ ہے، اس کی عسکری اور مزاحمتی قوت کو توڑنا اور وسائل بشمول عسکری اثاثہ جات کو اپنی گرفت اور کنٹرول میں لانا اس حکمت عملی کا مرکزی حصہ ہیں۔

ساتھ ہی ساتھ، نظریاتی اور تہذیبی جنگ کے ذریعے اسلام، اسلامی تحریکات اور اسلامی احیا کے تمام مظاہر کو ہدف بنایا جا رہا ہے اور اسلام کے ایک ایسے نمونے (version) کو مسلمانوں میں

پھیلانے کی کوشش ہورہی ہے جو سیاسی، معاشی اور تہذیبی میدان میں مغرب کے فکر اور نمونے کو قبول کرلے اور دین کو محض نمایشی رسوم تک محدود کردے۔ اس کے لیے روشن خیالی، موڈریشن، صوفی اسلام اور نہ معلوم کس کس عنوان کو استعمال کیا جارہا ہے اور اسلامی احیا اور سامراج مخالف رجحانات کو دہشت گردی، تشدد، جبر اور خونیں تصادم کے عنوان سے بدنام کرنے کی عالم گیر پیمانے پر منظم کوششیں ہورہی ہیں۔

اس خطرناک کھیل میں دانا دشمنوں کے ساتھ نادان دوست بھی اپنا اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔ پاکستان چونکہ اسلام کے نام پر قائم ہونے والا ملک ہے اس لیے وہ خصوصی ہدف بنا ہوا ہے۔ پاکستان عسکری طور پر مضبوط اور جوہری طاقت کا حامل ملک ہے اس لیے اس کی فوجی قوت اور جوہری صلاحیت کو خصوصی نشانہ بنایا جارہا ہے۔ دنیاے اسلام میں مغربی استعمار کو چیلنج کرنے والی جو بھی قوت ہے اسے کمزور اور غیرمؤثر کرنے کا کھیل کھیلا جارہا ہے۔ امریکا کی 'دہشت گردی کے خلاف جنگ'، مشرق وسطیٰ میں اسرائیل کے جارحانہ کھیل کی مکمل سرپرستی اور مسلم دنیا میں بیرونی افواج کے تسلط کے خلاف ہر مزاحمتی تحریک کو ہدف بنایا جارہا ہے۔ مصر، جو عرب دنیا کی ایک مؤثر ترین قوت تھا، اُسے اپنے مہروں کے ذریعے غیرمؤثر کردیا گیا۔ عراق، جو اسرائیل کے لیے ایک خطرہ تھا، اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی۔ افغانستان، جس نے اپنی بے سروسامانی کے باوجود روسی استعمار کا منہ پھیر دیا، اسے مسلسل خانہ جنگی میں جھونک دیا گیا، پھر القاعدہ پر یلغار کے نام پر اس پر اپنا فوجی تسلط قائم کردیا گیا اور افغانستان کے ساتھ پاکستان کو بھی نائن الیون کے واقعے کی لپیٹ میں لیتے ہوئے اپنی گرفت میں لے لیا گیا۔ جنرل پرویز مشرف کو جس طرح اپنے قابو میں کیا گیا اور پاکستانی فوج کو عملاً اپنے ہی ملک میں اپنی ہی قوم سے برسرِ پیکار کردیا گیا——— یہ سب اس خطرناک کھیل کا حصہ ہے۔

آج جو کچھ پاکستان میں ہورہا ہے اس کی اصل حقیقت کا اِدراک، اس پس منظر کے سمجھے بغیر، ممکن نہیں۔ آج پاکستان میں معصوم انسانوں کا خون بہایا جا رہا ہے۔ مسجدوں، امام بارگاہوں، مزاروں، فوجی تنصیبات، حساس اور فوجی اداروں کو نشانہ بنایا جارہا ہے۔ یہ ہر اعتبار سے قابلِ مذمت اور ایک نقصان کا سودا ہے لیکن اس تباہی سے نجات کے لیے ضروری ہے کہ دہشت گردی سے دنیا

کو پاک کرنے کے نام پر امریکا کی مسلط کردہ جنگ اور اس کی معاونت کے لیے کام کرنے والے اداروں، حکومتوں اور کارندوں کے کردار کو سمجھا جائے اور افراد، گروہوں اور حکومتوں، سب کی ان سرگرمیوں کو روکا جائے جو دراصل دہشت گردی کے فروغ کا ذریعہ بن چکی ہیں۔ امریکا اور مغربی اقوام کی ظالمانہ پالیسیوں کی تبدیلی اور عسکری، سیاسی، معاشی اور تہذیبی جنگ کے شعلوں کو بجھانے کی حکمت عملی ہی مسئلے کے سیاسی اور پایدار حل کا راستہ ہموار کرسکتی ہے۔ استعماری قوتوں اور ان کے حامیوں اور آلہ کاروں کی خون آشامیوں کو قابو میں لاکر ہی مزاحمتی قوتوں کو مذاکرات کی میز پر لانا اور معاملات کا سیاسی حل نکالنا ممکن ہوسکتا ہے۔ حقیقی مزاحمت کاروں اور جرائم پیشہ عناصر اور دوسروں کے مفاد کے لیے تباہی مچانے والے عناصر کو ایک دوسرے سے الگ کیا جاسکتا ہے اور پھر قانون اور انصاف کے اصولوں کے مطابق ہر نوعیت کے مجرموں کو سزا بھی دی جاسکتی ہے۔ اس طرح اس علاقے کو ایک بار پھر امن اور سلامتی کا گہوارا بنایا جاسکتا ہے۔

ہماری نگاہ میں حالات کو قابو میں لانے کے لیے مندرجہ ذیل امور ضروری ہیں:

عسکری نہیں سیاسی حل

اس امر کا اقرار اور اعلان کہ مسئلے کا حل سیاسی ہے، عسکری نہیں، اور عسکری کی ہر شکل کو بند کرنا ضروری ہے تاکہ اصل اسباب کی طرف توجہ دی جاسکے۔ تاریخ گواہ ہے کہ جنگ سیاسی مسائل کا حل نہیں۔ امریکا کی 'دہشت گردی کے خلاف جنگ' نے دہشت گردی کو فروغ دیا ہے اور اسے کچھ حلقوں اور علاقوں میں معتبر بنا دیا ہے۔ ۳ہزار افراد کی ہلاکت کا بدلہ لینے کے لیے لاکھوں افراد کو لقمۂ اجل بنایا جاچکا ہے، لاکھوں کو ہمیشہ کے لیے اپاہج کر دیا گیا ہے، لاکھوں کو بے گھر کیا جارہا ہے، ایک کے بعد دوسرے ملک کو تباہ و برباد کر دیا گیا ہے۔ معاشی حیثیت سے پوری دنیا کو تباہی کے دہانے پر لے آیا گیا ہے۔ اس ۱۰ سالہ جنگ میں صرف امریکا کو چھے سے ۱۰ ٹریلین ڈالر کا نقصان ہوا ہے۔ عراق اور افغانستان کو تباہ کردیا گیا ہے۔ صرف پاکستان میں ۳۶ہزار معصوم انسانوں، بچوں، بوڑھوں اور خواتین کو ہلاک کیا گیا ہے۔ ۵ہزار سے زائد فوجیوں اور قانون نافذ کرنے والے افراد کو زندگی کی نعمتوں سے محروم کر دیا گیا ہے۔ ایک لاکھ کے قریب افراد مجروح ہوئے ہیں، ۴۰لاکھ افراد اپنے ہی ملک میں بے گھر ہوگئے ہیں اور نقل مکانی پر مجبور ہوئے ہیں۔ معیشت کو

۹۰ سے ۱۰۰ ارب ڈالر کا نقصان ہوا ہے۔ شہروں اور دیہات کا امن تہ و بالا ہوگیا ہے، بھائی بھائی کا گلا کاٹ رہا ہے اور فوج اور قوم کے درمیان محبت، اعتماد اور احترام کا جو رشتہ تھا وہ پارہ پارہ ہوگیا ہے۔ جرائم پیشہ افراد اور ملک کے بیرونی دشمنوں نے اس فضا سے پورا فائدہ اٹھایا ہے اور اپنے مذموم کھیل کے لیے اس دھوئیں کی چادر (smoke screen) کو استعمال کیا ہے۔ حکومت، فوج اور قوم اس دلدل میں پھنستی چلی جارہی ہے۔

ملک میں انتہاپسندی، تشدد، دہشت گردی اور کشت و خون کے اس کھیل کو امریکا کی 'دہشت گردی کے خلاف جنگ' میں پاکستان کے کردار سے الگ کر کے نہ سمجھا جاسکتا ہے اور نہ کوئی حل نکالا جاسکتا ہے۔ اگر حکومت اور عسکری قیادت پارلیمنٹ کے متفقہ طور پر منظور شدہ قراردادوں اور پارلیمانی کمیٹی براے قومی سلامتی کے مرتب کردہ نقشۂ کار پر خلوص، دیانت اور حکمت کے ساتھ عمل کرنے کا راستہ اختیار کرے اور تمام سیاسی اور دینی قوتوں اور اس تصادم سے متاثر ہونے والے تمام عناصر کو شریک کر کے قومی سلامتی کے پروگرام پر عمل پیرا ہو، تو ایک مختصر وقت میں ہم اس جنگ سے نکل کر قومی تعمیر و ترقی کے لیے سرگرم ہوسکتے ہیں۔ اس سلسلے میں سیاسی قیادت اور عسکری ذمہ داران کو باہم مشاورت سے اور دستور اور سیاسی نظام کی بالادستی کے اصول کے تحت نقشۂ کار بنانا ہوگا۔ اس سلسلے میں یہ بھی بہت ضروری ہے کہ افغانستان سے امریکی اور ناٹو افواج کا انخلا ہو، افغانستان میں قومی سطح کی تمام اہم قوتوں کو باہمی مفاہمت کی بنیاد پر ایک میثاقِ ملّی پر مجتمع کیا جائے اور ایک دوسرے کی حاکمیت کے مکمل احترام کے ساتھ افغانستان اور اس کے تمام ہمسایہ ممالک علاقے کی سلامتی اور استحکام کا نقشہ تیار کرنے میں ایک دوسرے کے مدد و معاون ہوں۔

پاکستان کو امریکا کی گرفت سے نکالنے کے لیے ایک ایسی آزاد خارجہ پالیسی کی تشکیل ناگزیر ہے، جس کا مرکز و محور پاکستان کی آزادی، سلامتی، حاکمیت اور ترقی کے حصول کے لیے اس کے حقیقی مفادات کا تحفظ ہو، اور علاقے کے دوسرے تمام ممالک سے مشترک مفادات، باہمی تعاون اور انصاف اور بین الاقوامی قانون اور کنونشنز کی روشنی میں دوستی اور معاونت کا اہتمام ہو۔ یہ دیوانے کا خواب نہیں، وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے اور یہ پاکستان کی قیادت اور عوام کی ترجیح اوّل ہونی چاہیے۔ اس سلسلے میں یہ بھی ضروری ہے کہ امریکا کے ساتھ تعلقات کی نئی بنیادوں پر تشکیل کی

جائے۔ دہشت گردی کی جنگ سے نکلنے کا مقصد اور ہدف دوٹوک انداز میں واضح کردیا جائے۔ امریکا کی معاشی امداد سے، جس کا ہماری معیشت میں کوئی بنیادی کردار نہیں اور جس کے بغیر معیشت کو ٹھوس بنیادوں پر منظم کیا جاسکتا ہے، خوش اسلوبی سے نجات حاصل کی جائے۔ جن شرائط (terms of engagement) پر گذشتہ ۱۰سال سے معاملہ ہو رہا ہے، وہ سراسر پاکستان کے مفادات سے متصادم ہیں اور اس بارے میں دو آرا نہیں کہ پاکستان کی معیشت کو اس جنگ سے، اس امداد کے مقابلے میں جو ملی ہے، کم از کم ۸ گنا زیادہ نقصان ہوا ہے۔ اس امداد کا بہت کم حصہ پاکستان اور اس کے غریب عوام کے حصے میں آیا ہے، اور اس کے عوض ہماری آزادی اور عزت دونوں کا سودا ہوگیا ہے۔ ملک کی معیشت ٹھٹھر کر رہ گئی ہے۔ قرضوں کا بوجھ ناقابلِ برداشت حد تک بڑھ گیا ہے۔ ملک پر اس کی تاریخ کے پہلے ۶۱ برسوں میں قرض کا جو بوجھ پڑا ہے، وہ ساڑھے چار ہزار ارب روپے تھا، لیکن ان ساڑھے تین برسوں میں یہ بڑھ کر ۱۰ہزار ارب روپے سے تجاوز کرگیا ہے۔ گویا ۶۱ برسوں کے قرض ایک طرف، اور صرف ان تین برسوں کے قرض دوسری طرف۔ آج ہر وہ بچہ جو پاکستان میں آنکھیں کھول رہا ہے، ۶۰ ہزار روپے سے زیادہ کا مقروض پیدا ہو رہا ہے۔

وسائل کا صحیح استعمال

اللہ تعالیٰ نے پاکستان کو جن وسائل سے نوازا ہے، وہ خودانحصاری کی بنیاد پر ایک ترقی یافتہ ملک بننے اور ترقی کی دوڑ میں دوسرے ممالک سے آگے نکلنے کے لیے کافی ہیں۔ یہ ہماری ناکام پالیسیاں اور نااہل اور بددیانت قیادتیں ہیں جن کی وجہ سے یہ قدرتی دولت سے مالا مال ملک دوسروں کا دست نگر بن گیا ہے۔ اس وقت بیرونی اور اندرونی قرضوں پر سود اور قسط کی ادایگی پر ۹۰۰؍ارب روپے سالانہ خرچ کرنے پڑرہے ہیں، جب کہ حکومتی سطح پر تمام ترقیاتی منصوبوں پر سال میں بمشکل ۲۸۰؍ارب روپے خرچ ہو رہے ہیں اور ان کا بھی بڑا حصہ بدعنوانی کی نذر ہو رہا ہے۔ اس وقت ۳۲۰۰ ترقیاتی منصوبے نامکمل پڑے ہیں اور ان پر جو اربوں روپے خرچ ہوچکے ہیں وہ خسارے کا سودا ہیں۔

ملک میں کرپشن کا دور دورہ ہے اور اس کا اندازہ بھی کرنا مشکل ہے کہ اس کالے کنویں (black hole) میں کتنی قومی دولت ضائع ہو رہی ہے۔ محتاط اندازہ ۶۰۰ سے ۱۰۰۰؍ارب روپے

سالانہ کا ہے۔ اس پر مستزاد وہ شاہ خرچیاں ہیں جو حکومت اور بیوروکریسی کی پہچان بن گئی ہیں۔ ایسی ایسی ہوش ربا مستند داستانیں ٹی وی چینل پر آئی ہیں کہ یقین نہیں آتا۔ لیکن کوئی گرفت اور سزا نہیں۔ سپریم کورٹ کو بھی ''احترام، احترام'' کرتے، عملاً بے اثر کر دیا گیا ہے۔ دوسری طرف وزیروں، مشیروں اور خصوصی معاونین کی ریل پیل ہے۔ مرکز میں وزرا کم کرنے کا اعلان کیا گیا مگر جس دن امریکا ایبٹ آباد پر حملہ کر رہا تھا، اس وقت ایوانِ صدر میں ڈیڑھ درجن نئے وزرا حلف لے رہے تھے۔ سب سے غریب صوبے کا یہ حال ہے کہ اس کی اسمبلی میں ۶۰ ارکان ہیں مگر وزیروں اور مشیروں کی تعداد ۵۵ تک پہنچ چکی ہے۔ وزیراعظم نے اعلان کیا تھا کہ غیر ترقیاتی اخراجات میں ۳۰ فی صد کمی کی جائے گی مگر عملاً ان میں اضافہ ہوا ہے، برائے نام بھی کمی نہیں کی گئی۔

ادھر آمدنی کا یہ حال ہے کہ فیڈرل بیورو آف ریونیو کے مطابق ۱۵۸۰/ارب روپے سالانہ وصول ہو رہے ہیں، جب کہ ۱۱۰۰/ارب روپے سالانہ ٹیکس چوری کی نذر ہو رہے ہیں۔ اگر اس کا تین چوتھائی وصول کرلیا جائے تو بجٹ کا خسارہ ختم ہوسکتا ہے۔ پھر اہلِ ثروت کے بڑے بڑے گروہ ہیں جو ٹیکس کے نیٹ ورک میں آ ہی نہیں رہے۔ ان میں بڑے زمین دار، غیرمنقولہ جایدادوں کے مالک اور تاجر، اہم پیشہ ور افراد، جن میں وکلا، ڈاکٹر، انجینیر، اکاؤنٹنٹس وغیرہ شامل ہیں۔ اور پھر اسٹاک ایکسچینج کے تاجر اور وہاں حصص کا کاروبار کرنے والے اور اس میں بڑی رقوم کا منافع کمانے والے ہیں۔ اس وقت ٹیکس کی حد ۳ لاکھ روپے سالانہ آمدنی ہے، اس حد کو بڑھا کر ۴ یا ۵ لاکھ بھی کیا جاسکتا ہے، مگر جس کی آمدنی بھی ۵ لاکھ سالانہ یا اس سے زیادہ ہو، وہ واقعی ٹیکس دے تو حکومت کی آمدنی دگنی ہوسکتی ہے۔ اس وقت ۱۸ کروڑ افراد کے ملک میں صرف ۱۸ لاکھ افراد ٹیکس ادا کر رہے ہیں، جب کہ یہ تعداد کسی اعتبار سے بھی ۴۰ سے ۵۰ لاکھ سے کم نہیں ہونا چاہیے۔ اگر ٹیکس کے نیٹ ورک کو ایمان داری اور فرض شناسی کے ساتھ وسیع کیا جائے تو نہ حکومت کو قرضوں کی ضرورت ہو اور نہ بجٹ کا خسارہ ہمارا منہ چڑائے ___ لیکن یہ سب اسی وقت ممکن ہے جب ملک کو دیانت دار اور لائق قیادت میسر ہو، کرپشن کا خاتمہ کیا جائے، ملک میں قانون اور انصاف کا بول بالا ہو، احتساب کا مؤثر نظام موجود ہو، تمام ادارے اپنا اپنا کام دستور کے دائرے میں انجام دیں۔ معاشی پالیسیاں عوام دوست ہوں اور ترقی اور فلاحِ عامہ کے لیے بنائی جائیں اور ان پر دیانت سے عمل ہو۔

نظریاتی اساس کا استحکام

آج حالات بلاشبہہ بہت ہی خراب ہیں، مگر اللہ تعالیٰ نے اس ملک کو ان تمام مادی اور انسانی وسائل سے مالامال کیا ہے جو ترقی اور خوش حالی کے لیے ضروری ہیں ___ اصلاحِ احوال کے لیے ضروری ہے کہ اس وقت جو بنیادی خرابیاں ہیں، ان پر قابو پانے کی سرتوڑ کوشش کی جائے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ سب سے پہلے ہم اللہ کے حضور اپنی غلطیوں کا اعتراف کریں اور اصلاحِ احوال کے لیے خلوص اور دیانت سے زندگی کا ایک نیا ورق کھولیں۔ سب سے اہم چیز پاکستان کے قیام کے اصل مقصد اور عوام اور تاریخ سے کیے جانے والے وعدے کا پُرخلوص اعادہ ہے۔ علامہ اقبالؒ اور قائداعظم محمد علی جناحؒ نے جو وعدہ اللہ اور عوام سے کیا تھا وہ یہ تھا کہ:

> پاکستان کے نام سے ہم جو خطۂ زمین حاصل کرنا چاہتے ہیں، وہ اسلام کا گہوارا اور دورِ حاضر میں اسلامی نظام کی تجربہ گاہ ہوگا اور ہم اپنے لیے اور پوری دنیا کے لیے دورِ جدید میں اسلام کا نمونہ پیش کرنے کی کوشش کریں گے۔

۱۹۴۰ء کی قراردادِ پاکستان اور علامہ اقبال کے ۱۹۳۰ء کے الٰہ آباد خطبۂ صدارت کی یہی روح ہے۔ قائداعظم نے ۱۹۴۰ء کے کنونشن سے جو خطاب کیا، حصولِ پاکستان کے مقاصد کے سلسلے میں قیامِ پاکستان سے قبل ایک سو سے ایک اور قیامِ پاکستان کے بعد ۱۴ مرتبہ اعلانات کیے، مزید برآں ۱۹۴۶ء کے مسلم لیگ لیجسلیٹر کنونشن کی قرارداد، ۱۹۴۹ء کی قراردادِ مقاصد اور پھر ۱۹۵۶ء، ۱۹۶۲ء اور ۱۹۷۳ء کے دساتیر میں قراردادِ مقاصد اور ریاست کے لیے پالیسی کے رہنما اصولوں کی شکل میں ان وعدوں اور اعلانات کی قانون کی زبان میں تکرار ___ ان سب کا خلاصہ یہ ہے کہ پاکستان میں اسلامی تہذیب و تمدن کا احیا ہوگا اور اسلام عملاً یہاں نافذ ہوگا۔

آج امریکا اور نام نہاد لبرل حلقوں کی طرف سے پاکستان کے اسلامی تشخص کو مجروح کرنے اور ایک نظریاتی کے بجائے محض 'قومی ریاست' بنانے کی سرگرمیوں کا سختی سے نوٹس لینے کی ضرورت ہے۔ یہ ملک میں نظریاتی کش مکش اور انتشار پھیلانے کی سازش ہے اور اس کا بھرپور اور مؤثر مقابلہ ضروری ہے۔

دوسری چیز پاکستان کو امریکا کی سیاسی اور معاشی غلامی سے نکالنا اور آزاد خارجہ پالیسی کی

تشکیل ہے۔ نیز ملک کی معیشت، تعلیم اور تہذیبی اور سماجی زندگی کو عوام کے ایمان اور عزائم کے مطابق ڈھالنا اور خاص طور پر معاشی خودانحصاری اور عوام کی فلاح اور خوش حالی پر مرکوز کرنا ہے۔

تیسری چیز دستور کے دیے ہوئے نقشے کے مطابق: ● ریاست کے تمام اداروں کو مستحکم اور متحرک کرنا ● پارلیمنٹ کی بالادستی ● عدلیہ کی آزادی ● غیرجانب دار میڈیا کی آزادی ● تمام انسانوں کے حقوق کی مکمل پاس داری ● قانون کی حکمرانی ● مرکز اور صوبوں میں انصاف کی بنیاد پر دستور کے مطابق اختیارات اور وسائل کی تقسیم ● بیوروکریسی اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کی مکمل غیر جانب داری اور سیاسی وفاداریوں اور مفادات کے دباؤ سے دستوری تحفظ ● زندگی کے ہر شعبے کے لیے احتساب کا مؤثر اور غیر جانب دار نظام ● ملک کی افواج کو صرف ملک کے دفاع کے لیے مختص کرنا ● ان کو پیشہ ورانہ مہارت کی اعلیٰ ترین صلاحیتوں سے آراستہ کرنا ● ان کے سیاسی کردار کو بالکل ختم کرنا ضروری ہے۔

عوامی اعتماد اور اچھی حکمرانی

چوتھی چیز سیاسی نظام اور سیاسی قیادت پر عوام کا اعتماد اور ان کے درمیان مکمل ہم آہنگی ہے۔ اس وقت ہمارا المیہ ہی یہ ہے کہ عوام نے حکمرانوں کو جو مینڈیٹ فروری ۲۰۰۸ء کے انتخابات میں دیا تھا، اسے بُری طرح پامال کردیا گیا ہے۔ عوام نے جن تین باتوں کا اپنے مینڈیٹ کے مرکزی پیغام کے طور پر بہت ہی واضح انداز میں اظہار کیا، وہ یہ تھیں:

۱- جنرل پرویز مشرف کے دور، اس کے طرزِ حکمرانی اور اس کی پالیسیوں پر مکمل عدم اعتماد کا اظہار ـــــ اور صرف چہروں کی نہیں پالیسیوں اور طرزِ حکمرانی کی تبدیلی۔ یہی وجہ ہے کہ کسی ایک جماعت کو اکثریت حاصل نہ ہوئی بلکہ تبدیلی اور ایک نئے دور کے آغاز کی تمنا جس میں ملک کا مفاد، عوام کے حقوق اور حقیقی جمہوری طرزِ حکومت کا فروغ ان کا اصل ہدف تھا۔

۲- امریکا کی گرفت سے آزادی، امریکا کی 'دہشت گردی کے خلاف جنگ' سے علیحدگی، آزاد خارجہ پالیسی اور ملکی مفادات، علاقے میں امن اور اُمت مسلمہ کی مضبوطی کو خارجہ امور اور ملکی سیاست کا مرکز ومحور بنانا۔

۳- عدلیہ کی آزادی، فوج کے سیاسی کردار کی نفی، مرکز میں صوبوں کے درمیان اختیارات کی منصفانہ تقسیم، دستور کی اس کی اصل اسلامی، جمہوری، وفاقی اور فلاحی شناخت کے مطابق آمرانہ دور کی دراندازیوں سے پاک کر کے بحالی، ملک کو صحیح جمہوری خطوط پر منظم اور مضبوط کرنا، نیز بلوچستان کے ساتھ جو زیادتیاں اس زمانے میں ہوئی ہیں، ان کا فوری تدارک۔

یہ تین چیزیں وہ بنیاد تھیں جن پر عوام نے اپنا فیصلہ دیا۔ یہی وجہ تھی کہ انتخاب کے بعد جب حکومت کی تشکیل کا مرحلہ آیا تو ایک نوعیت کا قومی اتفاق راے پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ وزیراعظم کا انتخاب پارٹی بنیادوں پر کرنے کے بجاے پورے ایوان نے ان کو اعتماد کا ووٹ دیا اور جن جماعتوں نے اصول کی بنیاد پر انتخابات کا بائیکاٹ کیا تھا، انھوں نے بھی نئے قومی ایجنڈے پر حکومت کے کارفرما ہونے پر اسے تعاون کا یقین دلایا۔ لیکن چند ہی مہینوں میں یہ ساری توقعات خاک میں مل گئیں اور صدر زرداری نے مفاہمت کے نام پر مفادات اور منافقت کی سیاست کو فروغ دیا، سیاسی عہدوپیمان کو مذاق بنا دیا، کرپشن اور یاردوستوں کو نوازنے (cronyism) کی بدترین مثال قائم کی۔ اپنی پارٹی کے منشور اور اس میثاقِ جمہوریت کو ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا جسے دورِنو کا چارٹر بنا کر پیش کیا تھا۔ امریکا کی دراندازی کو اور بھی کھُل کھیلنے کا موقع دیا اور اپنی کرپشن کو تحفظ دینے کے لیے این آر او جیسے کالے قانون کو دستورِعمل بنایا، عدالت کی بحالی کے لیے ہرممکنہ رکاوٹ کھڑی کی اور جب مجبوراً اسے بحال کرنا پڑا تو اس کے بعد سے اس سے تصادم اور عدالت کے ہراہم فیصلے کو ناکام کرنے کے لیے سوچے سمجھے اقدامات کیے۔ امریکا کی مداخلت اتنی بڑھی کہ ڈرون حملے روز کا معمول بن گئے اور کھلے بندوں امریکا نے ایک متوازی نظام ملک میں قائم کرلیا اور اپنی مرضی سے جب چاہا ہماری حاکمیت کو پامال اور ہماری عزت کو داغ دار کیا۔ پھر معیشت کے میدان میں اس حکومت نے پہلے دن سے غلط اقدامات کی بھرمار کر دی، نااہلوں کو آگے بڑھایا اور تمام اداروں کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنے کی دوڑ شروع کر دی جس نے پوری دستوری اسکیم کو درہم برہم کر دیا۔

معیشت ایک کے بعد دوسرے بحران سے دوچار ہوئی، ترقی کی رفتار دو اور تین فی صد کے

درمیان پھنس گئی۔ افراطِ زر اور بے روزگاری نے عوام کی زندگی اجیرن کردی۔ بجلی کا بحران، گیس کی قلت، پٹرول اور اس کی مصنوعات کی قیمتوں میں ہوش ربا اضافہ، اشیاے خوردونوش کی قیمتیں آسمان سے باتیں کرنے لگیں، لاقانونیت کا دوردورہ ہے اور کسی کی جان، مال اور عزت کوئی چیز محفوظ نہیں ہے۔ خراب حکمرانی (bad governance) اور عوام کے مسائل اور مشکلات کے باب میں مجرمانہ بے حسی اس کا شعار بن گئے۔ حد یہ کہ خود اپنی قائد، جس کے نام پر اقتدار حاصل کیا، اس کے قاتلوں کا سراغ لگانے میں ناقابلِ یقین بے توجہی، بلکہ وہ رویہ اختیار کیا جس کے نتیجے میں قاتلوں کو تحفظ دیے جانے کے شبہات نے جنم لیا۔ جنرل پرویز مشرف سے مفاہمت اور پھر اس کی ملک سے باعزت رخصتی اور جن کو 'قاتل لیگ' کہا تھا ان کو شریکِ اقتدار کرنا اور جن کے بارے میں جولائی ۲۰۰۷ء کی لندن کانفرنس میں متفقہ طور پر طے کیا تھا کہ ان کے ساتھ کوئی سیاسی مفاہمت یا شراکت نہیں ہوگی، ان کو نہ صرف گلے سے لگایا بلکہ ان کی خوشنودی کے لیے ہراصول اور ضابطے کا کھلے بندوں خون کیا، جس کے نتیجے میں کراچی لاقانونیت کی بدترین تصویر پیش کرنے لگا۔ ان تین برسوں میں صرف کراچی میں ٹارگٹ کلنگ (ہدفی قتل) کے نتیجے میں ہزاروں افراد ہلاک ہوئے اور وہاں کی معیشت بُری طرح متاثر ہوئی۔

نئے انتخابات کی ضرورت

ان سوا تین برسوں میں حکومت نے جو کارنامے انجام دیے ہیں ان کے نتیجے میں جو صورت حال پیدا ہوئی ہے اسے ان چار نکات میں بیان کیا جاسکتا ہے:

۱- سیاسی اور اخلاقی جواز نہیں رہا ہے۔

۲- اعتبار اُٹھ گیا ہے۔

۳- نااہلیت ثابت ہوگئی ہے۔

۴- کرپشن کا دوردورہ ہے۔

یہ وہ چیزیں ہیں جن کی وجہ سے وہ مینڈیٹ جو عوام نے دیا تھا، اپنا جواز کھو چکا ہے۔ مینڈیٹ اچھی حکمرانی (good governance) کے لیے تھا، محض پانچ سال پورے کرنے اور بدترین اور کرپٹ ترین اندازِ حکمرانی کے لیے نہیں تھا۔ ایسے حالات میں دستوری مدت سے قبل

انتخابات اور عوام سے نیا مینڈیٹ حاصل کرنے کی ضرورت جمہوریت کا ایک بنیادی اصول ہے۔ بھارت میں گذشتہ ۶۳ برس میں نو مرتبہ انتخابات دستوری مدت پوری کرنے سے پہلے ہوئے ہیں۔ اسی طرح انگلستان میں دوسری جنگ کے بعد سے اب تک کئی بار پارلیمنٹ کے وسط مدتی انتخابات منعقد کیے گئے ہیں۔ نئے انتخاب کا انحصار حکومت کی کارکردگی اور عوام کے اعتماد یا بے اعتمادی کی روشنی میں کیا جاتا ہے۔ صاف نظر آرہا ہے کہ یہ حکومت اپنا جواز کھو چکی ہے، اس لیے ضروری ہے کہ نئے انتخابات کا انعقاد ہو، جو غیر جانب دار اور آزاد الیکشن کمیشن کے تحت نئے انتخابی قواعد کے مطابق ہوں۔ اس لیے کہ ۲۰۰۸ء کے انتخابات کے موقع پر جو ووٹروں کی فہرست تھی اس میں ۴۵ فی صد بوگس ووٹ تھے جس کا اعتراف نادرا اور عدالتِ عالیہ نے کیا ہے۔

ملک کو سیاسی انتشار، معاشی بدحالی اور امریکا کی غلامی سے نجات دلانے کے لیے یہ سب سے معقول اور جمہوری اعتبار سے معتبر راستہ ہے۔ ٹیکنو کریٹس کی حکومت کی کوشش اور فوج کی کسی بھی شکل میں مداخلت حالات کو بگاڑنے کا ذریعہ تو ہو سکتے ہیں، اصلاحِ احوال کی طرف پیش رفت کا موجب نہیں ہو سکتے۔

متفقہ قرارداد کے تقاضے

اس کے ساتھ اس امر کی ضرورت ہے کہ پارلیمنٹ کے مشترک اجلاس کی متفقہ قرارداد پر اس کے الفاظ اور روح کے مطابق فوری طور پر عمل ہو، جس کے کم از کم تقاضے یہ ہیں:

اوّل: ۲ مئی کے واقعے کے تمام پہلوؤں کا بے لاگ اور غیر جانب دارانہ جائزہ لینے کے لیے ایک اعلیٰ سطحی آزاد کمیشن کا قیام جو انٹیلی جنس کی ناکامی اور قومی سلامتی کے تحفظ میں ناکامی (security failure) کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لے اور پوری پیشہ ورانہ مہارت اور دیانت کے ساتھ تمام حقائق پارلیمنٹ اور قوم کے سامنے لائے۔ عوام کا اعتماد حکومت اور دفاع اور قومی سلامتی کے اداروں پر متزلزل ہو گیا ہے۔ ۲۲ مئی کے واقعے نے حالات کی نزاکت اور مخدوش صورت حال کو اور بھی گمبھیر کر دیا ہے۔ اس لیے اس کمیشن کا فی الفور قیام ملک کی سلامتی کے لیے ضروری ہے۔

دوم: امریکا سے تعلقات پر مکمل نظرثانی کا آغاز بھی فوری طور پر ہو جانا چاہیے۔ قوم کے سامنے وہ سارے حقائق آنے چاہییں جن پر آج تک پردہ پڑا رہا ہے۔ کچھ حقائق امریکا کے عملی

رویے اور جارحانہ کارروائیوں سے اور کچھ وکی لیکس کے انکشافات سے سامنے آرہے ہیں اور کچھ ریمنڈ ڈیوس کے واقعے سے سامنے آئے ہیں۔ ان پس پردہ حقائق نے کچھ بنیادی سوالات کو بھی جنم دیا ہے جن کا جواب قوم اور پارلیمنٹ کے لیے جاننا ضروری ہے۔ ماضی میں جو بھی کھلے عام یا خفیہ مفاہمت تھی، اس کو ختم ہونا چاہیے اور تمام معاملات کو دو اور دو چار کی طرح تحریری طور پر طے ہونا چاہیے اور وہ کابینہ اور پارلیمنٹ کے علم میں لائے جانے چاہییں۔ اس قرارداد اور پارلیمنٹ کی اس سے پہلے کی قراردادوں کی روشنی میں یہ بالکل واضح ہے کہ پارلیمنٹ کی نگاہ میں:

۱- خارجہ پالیسی کو آزاد ہونا چاہیے اور امریکا سے خودمختارانہ برابری (sovereign equality) کے اصول کی بنیاد پر معاملات طے ہونے چاہییں جن کا محور پاکستان کی آزادی، حاکمیت، نظریاتی تشخص، اور اس کے سیاسی، معاشی اور علاقائی مفادات کا مکمل تحفظ ہے۔

۲- دہشت گردی کے خلاف جنگ سے باعزت دُوری اور اس اصول کی بنیاد پر نئی حکمت عملی کا تعین کہ اس مسئلے کا کوئی فوجی حل نہیں۔ اصل حل سیاسی ہے اور اس کے لیے مذاکرات کے سوا کوئی طریقہ نہیں۔ ان مذاکرات میں تمام متعلقہ عناصر (stake holders) کی شرکت لازمی ہے۔ دہشت گردی کے خاتمے کے لیے مکالمہ (Dialogue) ترقی (Development) اور باز رکھنا (Deterrence) (یعنی تین Ds) ہی صحیح طریقہ ہے۔

سوم: پاکستان کی حاکمیت اور خودمختار سرحدوں (sovereign borders) کا تحفظ اولین اہمیت کا مسئلہ ہے۔ ڈرون حملے ہماری حاکمیت کی کھلی خلاف ورزی ہیں اور امریکا یا کسی کی طرف سے بھی کوئی یک طرفہ مداخلت ہماری حاکمیت اور اقوامِ متحدہ کے چارٹر اور بین الاقوامی قانون کی خلاف ورزی ہے جسے کسی صورت میں برداشت نہیں کیا جاسکتا۔ امریکا کو اس سلسلے میں صاف وارننگ دے دی جائے اور اگر اس کے بعد بھی کوئی ڈرون حملہ ہو یا کسی بھی شکل میں فوجی مداخلت ہوتی ہے تو ناٹو افواج کی راہداری کی سہولتیں فوراً ختم کی جائیں اور تمام دفاعی صلاحیتوں کا بھرپور استعمال ہو۔ ہم امریکا سے تصادم نہیں چاہتے، لیکن امریکا کو اپنی سرزمین پر اس نوعیت کے جارحانہ فوجی اقدامات کی اجازت بھی نہیں دے سکتے۔ اگر کیوبا ۱۹۶۰ء سے امریکا کی دراندازیوں کا مقابلہ کرسکتا ہے اور جنوبی امریکا کے نصف درجن سے زیادہ ممالک امریکا کو اس کی اپنی حدود میں

رکھنے اور اپنی عزت اور آزادی کے تحفظ کے لیے سینہ سپر ہوسکتے ہیں، اگر شمالی کوریا امریکا اور جنوبی کوریا دونوں کو اپنی حدود کو پامال کرنے سے روک سکتا ہے تو پاکستان جو ایک ایٹمی طاقت ہے، جس کے عوام نے اپنی افواج کو دفاع کے لیے ناقابلِ تسخیر قوت کی فراہمی کے لیے اپنا پیٹ کاٹ کر وسائل فراہم کیے ہیں، وہ ملک کی سرحدوں اور قیمتی اثاثوں کا دفاع کیوں نہیں کرسکتیں، جب کہ ہمارے عسکری قائدین پبلک اور پرائیویٹ ہر موقع پر یقین دلاتے ہیں کہ ان شاء اللہ دفاع کا حق ادا کریں گے، ان کو صرف سول حکومت کی اجازت اور اشارے کی ضرورت ہے۔

چہارم: ملک کے سلامتی کی صورت حال (security paradigm) پر بھی ازسرِنو غور کی ضرورت ہے۔ اس میں مشرق اور مغرب ہر سمت سے جو خطرات ممکن ہیں، ان کا ادراک ضروری ہے۔ امریکا کے رویے کی وجہ سے خطرے کے ادراک (threat perception) پر نظرثانی کی جو ضرورت ہے، اس پر عسکری اور سیاسی قیادت دونوں کو فوری طور پر توجہ دینے اور سلامتی کی حکمت عملی کو ازسرِنو مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔ اسی طرح امریکا کی 'دہشت گردی کے خلاف جنگ' سے نکلنے کے ساتھ ساتھ اس پر بھی غور کرنا ہوگا کہ پاکستان کی سرزمین ملک کے اندر یا ملک کے باہر، دوسروں کے لیے کسی نوعیت کی بھی دہشت گردی کے لیے استعمال نہ ہونے دیا جائے، اور اس کے لیے دہشت گردی کے خلاف جس حکمت عملی، اختیار اور قانون سازی کی ضرورت ہے اس پر فوری توجہ دی جائے۔ دہشت گردی اور جنگ آزادی دو الگ الگ چیزیں ہیں لیکن حقیقی دہشت گردی کسی بھی ملک کے لیے قابلِ برداشت نہیں۔ البتہ ان اسباب کی اصلاح بھی ضروری ہے جو جمہوری اور قانونی راستوں کو غیرمؤثر بناتے ہیں اور لوگوں کو غلط راستوں کی طرف دھکیلتے ہیں۔ اس کے لیے سیاسی، نظریاتی، اخلاقی اور قانونی تمام پہلوؤں کو سامنے رکھ کر ایک جامع حکمت عملی بنانے کی ضرورت ہے۔

پنجم: پارلیمنٹ کی قراردادوں کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ پاکستان اور اس کے سفارت کار پاکستان کے موقف کو دنیا کے سامنے دلیل کے ساتھ اور مؤثر ترین انداز میں پیش کریں اور سفارتی فعالیت (activism) کا راستہ اختیار کیا جائے۔ آج پاکستان کے امیج کو خراب کرنے اور اسے ایک ناکام یا ناکامی کی طرف بڑھتی ہوئی ریاست کی شکل میں بڑے منظم انداز میں پیش کیا جارہا ہے۔ بلاشبہہ ہمیں اپنے گھر کی اصلاح کرنی ہے لیکن اس کے ساتھ اپنے موقف کے ابلاغ اور دنیا

میں دوستوں کو متحرک کرنے کی بھی ضرورت ہے۔

ہمارے بعض دانش ور، میڈیا کے بعض حلقے اور وہ عناصر جو پاکستان کو امریکا کے زیراثر رکھ کر عوام کی آرزوؤں کے برخلاف سیکولر اباحیت پسند معاشرہ چاہتے ہیں ملک کے خیرخواہ بن کر یہ نقشہ کھینچ رہے ہیں اور ڈرا رہے ہیں___ اگر امریکی امداد بند ہوگئی تو ہماری معیشت بالکل بیٹھ جائے گی اور پاکستان ختم ہوجائے گا۔ انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ اس سے پہلے چار دفعہ: ۱۹۶۵ء، ۱۹۷۱ء، ۱۹۸۹ء اور ۱۹۹۸ء میں امریکا نے اپنی ہر طرح کی معاشی اور عسکری معاونت ختم کر دی تھی لیکن الحمدللہ! پاکستانی معیشت پر کوئی منفی اثر نہیں پڑا اور ترقی کا سفر جاری رہا۔ موجودہ حالات میں یہ حکومت یا کوئی دوسری حکومت عزت و وقار کے ساتھ امریکی امداد کو ٹھکرا دے تو پاکستان کے عوام کے لیے خیروبرکت کا باعث ہوگا اور ہماری معیشت اپنے پاؤں پر کھڑی ہوجائے گی۔ عوام بھی ایک جذبے سے بڑھ کر اپنا حصہ ادا کریں گے، ٹیکس بھی زیادہ ملیں گے اور کرپشن میں بھی کمی آئے گی۔

سب سے زیادہ اہمیت اس بات کی ہے کہ ہم دنیا کے مظلوم انسانوں اور مسلم اُمت کے عام نفوس تک پہنچیں اور ان کی قوت کو اپنے لیے مسخر و منظم کریں۔ ایسے حکمرانوں سے تائید ہماری قوت کا ذریعہ نہیں جو خود ظلم و استبداد کے مرتکب ہوں۔ ہماری اصل ہم آہنگی اپنے ملک کے عوام اور تمام دنیا کے عوام سے ہونی چاہیے جو اس 'دہشت گردی کے خلاف جنگ' سے برأت کا اعلان کرتے ہیں۔ مسلم دنیا کے ۹۰ فی صد عوام اس جنگ کو ایک ناحق جنگ سمجھتے اور امریکا کو اس کی مسلم کش پالیسیوں کی وجہ سے اپنا دوست نہیں سمجھتے۔ اب خود امریکی رائے عامہ کے تازہ ترین جائزوں کی روشنی میں آبادی کے ۶۲ فی صد نے اس جنگ سے امریکا کے نکلنے کے حق میں رائے کا اظہار کیا ہے۔

آخری چیز ملک کی معیشت کو سنبھالنا، نئی معاشی پالیسی کی تشکیل اور اس پر عمل درآمد کا انتظام ہے۔ معیشت کی اصلاح کا بڑا قریبی تعلق سیاسی تبدیلی اور آزاد خارجہ پالیسی اور علاقائی امن و سلامتی کے لیے علاقے کے ممالک کے ساتھ مل کر نئے دروبست کے قیام پر ہے، اور حالات اسی طرح اشارہ کر رہے ہیں۔ اس تبدیلی کے لیے موجودہ قیادت سے توقع عبث ہے۔ اس کا راستہ عوام کو متحرک کرنے اور عوام کی قوت سے دستور کے مطابق جمہوری عمل کے لیے نئی قیادت کو زمامِ کار سنبھالنے کا موقع فراہم کرنا ہے۔ آج پاکستان ہم سے اس جدوجہد کا مطالبہ کر رہا ہے۔

منفی سوچ

دنیا کی سب سے زیادہ عام بیماری منفی سوچ ہے۔ یہ بیماری زندگی کو تباہ کردیتی ہے۔ انسان ذہنی، نفسیاتی، جذباتی، نظری وفکری لحاظ سے بانجھ ہو جاتا ہے۔ ایسا انسان دوسرے انسانوں کے لیے خطرہ بن جاتا ہے۔ جدید دنیا میں یہ بیماری تیزی سے پھیلتی جارہی ہے۔ ٹکنالوجی کی چکاچوند اور ترقی کی معراج پر دستک دینے کے باوجود انسان اور معاشرے اس بیماری کی وجہ سے کھنڈر بن جاتے ہیں۔

اسلامی نقطۂ نظر سے مایوسی، بدگمانی، سوے ظن، حوصلہ شکنی، پست ہمتی، تذبذب، ضعفِ ارادہ، اضمحلال، شک، تردد، فرار جیسے رویے بالآخر منافقت اور کفر کی طرف لے جاتے ہیں۔ ایمان ویقین کے چراغ جس دل میں روشن ہوں وہاں ان مفاسد کا گزر نہیں ہوسکتا۔ منفی سوچ کے ہزاروں مظاہر ہیں لیکن اخلاقی طور پر کنجوسی، کینہ، شقی القلبی، طمع، بے وفائی، غرور جیسے رویے اس کا مظہر ہیں۔ منفی سوچ سے اجتناب اور اس کی بیخ کنی کرنا ضروری ہے۔ اس کو مثبت سوچ سے تبدیل کرنا چاہیے۔ اس سلسلے میں درج ذیل باتیں رہنمائی فراہم کرسکتی ہیں:

۱- ایمان کی نشوونما کے ذریعے سے منفی سوچ کو منقطع کیا جاسکتا ہے۔ ایمان زندگی کو عبادت سمجھ کر گزارنے کی دعوت دیتا ہے۔ ایسا ولولہ، اضطراب، جنون اور لطف دیتا ہے جو ہر قسم کی منفی سوچ اور عمل کے گرد حصار قائم کردیتا ہے۔

۲- اخلاص کے نتیجے میں انسان برائی کرنے اور برائی کے مضر اثرات سے بچنے کا سامان کرسکتا ہے۔ اخلاص کی تعمیر ایمان کی بنیاد پر ہوتی ہے۔

۴- اعلیٰ مقاصد، بلند عزائم اور پختہ ارادے سے منصوبہ بنانے اور حصول کے لیے کام کرنے سے منفی سوچ کو پنپنے کی گنجایش نہیں ملتی ہے۔ عمل سے کنارہ کشی منفی سوچ کا پہلا زینہ ہے۔

۵- ماضی اور حال کی بحثوں میں زیادہ الجھنے کے بجاے مستقبل کی طرف نگاہیں جما کر چلنا چاہیے۔ نہ ہونے کی حسرت اور غلط پر افسوس کو طاری نہیں کرنا چاہیے۔ ہر آن ایک نیا آغاز ہوسکتا ہے۔

۶- اچھی صحبت اور اچھی گفتگو، صحت مند تفریح اور خوراک، یہ سب چیزیں خوش کن نتائج پیدا کرتی ہیں۔ ذاتی سوچ کو اچھا رخ دینے کا باعث بنتی ہیں۔

سنابل العلم

آپ کی اصل ذمہ داری

اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو انتخاب اور ارادے کی آزادی بخشی ہے، اور اسی آزادی کے استعمال میں اُس کا امتحان ہے۔ اِس حقیقت کو اگر آپ ذہن نشین کرلیں تو آپ کو یہ سمجھنے میں کوئی زحمت پیش نہ آئے گی کہ کسی ملک یا قوم یا زمانے کے انسانوں میں اگر کوئی دعوتِ باطل فروغ پاتی ہے، یا کوئی نظامِ باطل غالب رہتا ہے، تو یہ اُس دعوت اور اُس نظام کی کامیابی نہیں بلکہ اُن انسانوں کی ناکامی ہے جن کے اندر ایک باطل دعوت یا نظام نے عروج پایا۔ اِسی طرح دعوتِ حق اور اس کے لیے کام کرنے والے اگر اپنی حد تک صحیح طریقے سے اصلاح کی کوشش کرتے رہیں اور نظامِ حق قائم نہ ہوسکے تو یہ نظامِ حق اور اس کے لیے کام کرنے والوں کی ناکامی نہیں، بلکہ ان انسانوں ہی کی ناکامی ہے جن کے معاشرے میں صداقت پروان نہ چڑھ سکی اور بدی ہی پھلتی پھولتی رہی۔

دنیا میں حق اور باطل کی کش مکش بجائے خود ایک امتحان ہے، اور اس امتحان کا آخری نتیجہ اِس دنیا میں نہیں بلکہ آخرت میں نکلنا ہے۔ اگر دنیا کے انسانوں کی عظیم اکثریت نے کسی قوم، یا ساری دنیا ہی نے حق کو نہ مانا اور باطل کو قبول کرلیا تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ حق ناکام اور باطل کامیاب ہوگیا، بلکہ اس کے معنی دراصل یہ ہیں کہ انسانوں کی عظیم اکثریت اپنے رب کے امتحان میں ناکام ہوگئی جس کا بدترین نتیجہ وہ آخرت میں دیکھے گی۔ بخلاف اس کے وہ اقلیت جو باطل کے مقابلے میں حق پر جمی رہی اور جس نے حق کو سربلند کرنے کے لیے جان و مال کی بازی لگادی، اِس امتحان میں کامیاب ہوگئی اور آخرت میں وہ بھی اپنی اِس کامیابی کا بہترین نتیجہ دیکھ لے گی۔ یہی بات ہے جو نوعِ انسانی کو زمین پر اُتارتے وقت اللہ تعالیٰ نے صاف صاف بتادی تھی کہ فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ هُدًی فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَ لَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ۝ وَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَاۤ اُولٰٓىٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ (البقرہ ۲:۳۸-۳۹)

’’پھر جو میری طرف سے کوئی ہدایت تمھارے پاس پہنچے، تو جو لوگ میری اُس ہدایت کی پیروی کریں گے، اُن کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہ ہوگا، اور جو اس کو قبول کرنے سے انکار کریں گے اور ہماری آیات کو جھٹلائیں گے، وہ آگ میں جانے والے ہیں، جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے‘‘۔

اس حقیقت کو آپ جان لیں تو یہ بات بھی آپ کی سمجھ میں بخوبی آسکتی ہے کہ اہلِ حق کی اصل ذمہ داری یہ نہیں ہے کہ وہ باطل کو مٹا دیں اور حق کو اس کی جگہ قائم کر دیں، بلکہ ان کی اصل ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اپنی حد تک باطل کو مٹانے اور حق کو غالب و سربلند کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ صحیح اور مناسب و کارگر طریقوں سے کوشش کرنے میں کوتاہی نہ کریں۔ یہی کوشش خدا کی نگاہ میں ان کی کامیابی و ناکامی کا اصل معیار ہے۔ اس میں اگر ان کی طرف سے دانستہ کوئی کوتاہی نہ ہو تو خدا کے ہاں وہ کامیاب ہیں، خواہ دنیا میں باطل کا غلبہ ان کے ہٹائے نہ ہٹے اور شیطان کی پارٹی کا زور اُن کے توڑے نہ ٹوٹ سکے۔

بسا اوقات آدمی کے ذہن میں یہ اُلجھن بھی پیدا ہوتی ہے کہ جب یہ دین خدا کی طرف سے ہے، اور اس کے لیے کوشش کرنے والے خدا کا کام کرتے ہیں، اور اس دین کے خلاف کام کرنے والے دراصل خدا سے بغاوت کرتے ہیں، تو باغیوں کو غلبہ کیوں حاصل ہو جاتا ہے اور وفاداروں پر ظلم کیوں ہوتا ہے؟ لیکن اُوپر جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس پر غور کرنے سے آپ اس سوال کا جواب بھی خود پا سکتے ہیں۔ درحقیقت یہ اُس آزادی کا لازمی نتیجہ ہے جو امتحان کی غرض سے انسانوں کو دی گئی ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ ہوتی کہ زمین میں صرف اس کی اطاعت فرماں برداری ہی ہو اور سرے سے کوئی اس کی رضا کے خلاف کام نہ کر سکے، تو وہ تمام انسانوں کو اُسی طرح مطیع فرمان پیدا کر دیتا جس طرح جانور اور درخت اور دریا اور پہاڑ مطیع فرمان ہیں۔ مگر اس صورت میں نہ امتحان کا کوئی موقع تھا اور نہ اس میں کامیابی پر کسی کو جنت دینے اور ناکامی پر کسی کو دوزخ میں ڈالنے کا کوئی سوال پیدا ہو سکتا تھا۔

اس طریقے کو چھوڑ کے جب اللہ تعالیٰ نے یہ طریقہ اختیار فرمایا کہ نوعِ انسانی اور اس کے ایک ایک فرد کا امتحان لے، تو اس کے لیے ضروری تھا کہ ان کو انتخاب اور ارادے کی (بقدرِ ضرورتِ امتحان) آزادی عطا فرمائے، اور جب اُس نے ان کو یہ آزادی عطا فرما دی تو اب یہ ممکن نہیں ہے کہ

اللہ تعالیٰ اُوپر سے مداخلت کر کے زبردستی باغیوں کو ناکام اور وفاداروں کو غالب کر دے۔ اس آزادی کے ماحول میں حق اور باطل کے درمیان جو کش مکش برپا ہے اس میں حق کے پیرو، اور باطل کے علَم بردار اور عام انسان (جن میں عام مسلمان بھی شامل ہیں)، سب امتحان گاہ میں اپنا اپنا امتحان دے رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وفاداروں کی ہمت افزائی اور باغیوں کی حوصلہ شکنی ضرور کی جاتی ہے، لیکن ایسی مداخلت نہیں کی جاتی جو امتحان کے مقصد ہی کو فوت کر دے۔ حق پرستوں کا امتحان اس میں ہے کہ وہ حق کو غالب کرنے کے لیے کہاں تک جان لڑاتے ہیں۔ عام انسانوں کا امتحان اس میں ہے کہ وہ حق کے علَم برداروں کا ساتھ دیتے ہیں یا باطل کے علَم برداروں کا۔ اور باطل پرستوں کا امتحان اس میں ہے کہ وہ حق سے منہ موڑ کر باطل کی حمایت میں کتنی ہٹ دھرمی دکھاتے ہیں اور حق کی مخالفت میں آخر کار خباثت کی کس حد تک پہنچتے ہیں۔ یہ ایک کھلا مقابلہ ہے جس میں اگر حق اور راستی کے لیے سعی کرنے والے پِٹ رہے ہوں تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ حق ناکام ہو رہا ہے اور اللہ تعالیٰ خاموشی کے ساتھ اپنے دین کی مغلوبی کو دیکھ رہا ہے، بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ حق کے لیے کام کرنے والے اللہ کے امتحان میں زیادہ سے زیادہ نمبر پا رہے ہیں۔ اُن پر ظلم کرنے والے اپنی عاقبت زیادہ سے زیادہ خراب کرتے چلے جا رہے ہیں، اور وہ سب لوگ اپنے آپ کو بڑے خطرے میں ڈال رہے ہیں جو اس مقابلے کے دوران میں محض تماشائی بن کر رہے ہوں، یا جنھوں نے حق کا ساتھ دینے سے پہلوتہی کی ہو، یا جنھوں نے باطل کو غالب دیکھ کر اس کا ساتھ دیا ہو۔

یہ خیال کرنا صحیح نہیں ہے کہ جو لوگ مسلمانوں میں شمار ہوتے ہیں وہ اس امتحان سے مستثنیٰ ہیں، یا محض مسلمان کہلایا جانا ہی اس امتحان میں ان کی کامیابی کا ضامن ہے، یا مسلمان قوموں اور آبادیوں میں دین سے انحراف کا فروغ پانا اور کسی فاسقانہ نظام کا غالب رہنا کوئی عجیب معمّا ہے جو حل نہ ہو سکے اور ذہنی اُلجھن کا موجب ہو۔ خدا کی اس کھلی امتحان گاہ میں کافر، مومن، منافق، عاصی اور مطیع، سب ہی ہمیشہ اپنا امتحان دیتے رہے ہیں اور آج بھی دے رہے ہیں۔ اس میں فیصلہ کن چیز کوئی زبانی دعویٰ نہیں بلکہ عملی کردار ہے۔ اور اس کا نتیجہ بھی مردم شماری کے رجسٹر دیکھ کر نہیں بلکہ ہر شخص کا، ہر گروہ کا اور ہر قوم کا کارنامۂ حیات دیکھ کر ہی ہوگا۔ (رسائل و مسائل، پنجم، ص ۳۲۷-۳۳۱)

کلام نبویؐ کی کرنیں

مولانا عبدالمالک

حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰؓ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ احزاب میں دعا مانگی: اَللّٰھُمَّ مُنْزِلَ الْکِتَابِ، سَرِیعَ الْحِسَابِ ، اَللّٰھُمَّ اھْزِمْھُمْ وَزَلْزِلْھُمْ (بخاری، کتاب الجہاد، حدیث ۲۹۳۳) ”اے اللہ! کتاب نازل فرمانے والے، جلدی حساب لینے والے، اے اللہ انھیں شکست سے دوچار فرما اور انھیں ہلا ڈال“۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ساتھیوں سمیت سخت جاڑے اور بھوک کی حالت میں غزوۂ احزاب کے موقعے پر جہاد میں حصہ لیا۔ اس وقت آپؐ نے اس بے چارگی کی حالت میں دعا فرمائی۔ اللہ تعالیٰ نے دعا قبول فرمائی، تیز آندھی چلادی جس نے کفارِ قریش کے خیمے اُلٹ دیے اور وہ شکست سے دوچار ہوکر بھاگ کھڑے ہوئے۔ آج بھی کفار کے مقابلے میں سینہ سپر ہوکر مقابلہ کرنے والوں کا بڑا ہتھیار دعا ہے۔ دعا کرنے والے کو مایوسی نہیں ہوتی بشرطیکہ دعا کے ساتھ عمل بھی ہو۔ اِلَیْہِ یَصْعَدُ الْکَلِمُ الطَّیِّبُ وَ الْعَمَلُ الصَّالِحُ یَرْفَعُہٗ (الفاطر ۳۵:۱۰)۔ ”اسی کی طرف پاکیزہ کلمے چڑھتے ہیں اور نیک عمل ان کو اٹھاتا ہے“۔

○

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جنت البقیع میں تشریف لائے اور کہا: اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ اَھْلَ الدِّیَارِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُسْلِمِیْنَ وَ اِنَّآ اِنْ شَآءَ اللّٰہُ بِکُمْ لَاحِقُوْنَ، ”اے مومنین و مسلمین کے گھر والو! تم پر سلام ہو اور ہم بھی ان شاء اللہ بہت جلد تم سے آملنے والے ہیں“۔ پھر فرمایا: میری آرزو ہے کہ ہم نے اپنے بھائیوں کو دیکھا ہوتا۔ صحابہؓ نے عرض کیا: یارسولؐ اللہ! ہم آپ کے بھائی نہیں ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: تم میرے ساتھی ہو،

ہمارے بھائی وہ ہیں جو ابھی نہیں آئے۔ صحابہؓ نے عرض کیا: یارسولؐ اللہ! آپ کیسے پہچانیں گے اپنی اُمت کے ان لوگوں کو جو ابھی نہیں آئے؟ آپؐ نے فرمایا: یہ بتلاؤ اگر ایک آدمی ایسا ہے کہ اس کے گھوڑے کی پیشانی اور پاؤں پر سفید داغ ہوں اور وہ ان گھوڑوں میں ہوں جو کالے کلوٹے ہوں تو وہ اپنے گھوڑوں کو نہیں پہچان سکے گا؟ صحابہؓ نے کہا: کیوں نہیں؟ آپؐ نے فرمایا: میری اُمت کے لوگ قیامت کے روز آئیں گے کہ ان کی پیشانیاں اور پاؤں وضو کے آثار سے چمک رہے ہوں گے، میں حوضِ کوثر پر ان کے منتظم کے طور پر آگے موجود ہوں گا۔ سنو! کچھ لوگوں کو میرے حوض سے دفع کیا جائے گا جس طرح گم شدہ اُونٹ کو حوض سے ہٹایا جاتا ہے۔ میں انھیں پکاروں گا: لوگو! آجاؤ، تو جواب میں کہا جائے گا کہ انھوں نے آپؐ کے بعد دین میں تبدیلی کر دی تھی۔ (مسلم، کتاب الطہارہ، حدیث ۵۸۴)

قیامت کے روز وضو کے آثار سے اعضاے وضو میں چمک دمک ہوگی اور اعضاے وضو کی چمک دمک کو دیکھ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نمازیوں کو اپنے حوض پر بلائیں گے لیکن وہ لوگ جو دین میں تبدیلی کے مرتکب ہوں گے وہ حوضِ کوثر کے ٹھنڈے اور میٹھے جاموں سے محروم ہوں گے۔ نماز اور وضو کی برکت اپنی جگہ برحق ہے لیکن دین میں تبدیلیوں کا جرم ان برکتوں کے اثرات میں رکاوٹ بن کر کھڑا ہو جائے گا۔ دین میں تبدیلیوں کے اس جرم کی راہ کو روکنا ضروری ہے، چاہے انفرادی سطح پر ہو یا حکومتی سطح پر۔ حکومتی سطح پر دین کی شکل کو بگاڑنے کی جو مذموم کوشش ہو رہی ہے اسے روکنے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے۔

○

حضرت ثوبانؓ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے میرے لیے زمین کو سمیٹا، میں نے اس کے مشرقوں اور مغربوں کو دیکھا اور میری اُمت کا اقتدار ان تمام علاقوں تک پہنچے گا جو مجھے دکھلائے گئے اور مجھے دونوں خزانے سرخ اور سفید (سونا چاندی) دیے گئے اور میں نے اپنے رب سے سوال کیا کہ میری اُمت کو قحط سالی سے نہ ہلاک کرے اور ان پر ان کے غیر کو مسلط نہ کرے کہ ان کی اجتماعیت کو منتشر کر دے، اگرچہ وہ تمام روے زمین سے مل کر حملہ آور ہوں۔ میرے یہ سوال مان لیے گئے، البتہ وہ آپس میں ایک دوسرے کو ہلاک اور قید کریں گے۔ (مسلم، حدیث ۷۲۵۸)

یہ حدیث اُمت مسلمہ کے لیے اُمید کی ایک کرن ہے۔ کفار ساری دنیا سے آج اُمت مسلمہ پر حملہ آور ہیں لیکن وہ کامیاب نہ ہوسکیں گے۔ عالمِ اسلام پر مستقل طور پر ان کا تسلط نہ ہوسکے گا، البتہ وقتی طور پر وہ مسلمانوں کو نقصان پہنچاسکیں گے لیکن آخری فتح اسلام اور اہلِ اسلام کو حاصل ہوگی۔ آج اس بات کی ضرورت ہے کہ کفار کے مقابلے کے لیے جامع منصوبہ بندی کی جائے۔ فکری اور عسکری دونوں محاذوں پر صف بندی کی جائے۔ ان شاءاللہ کفار اپنے عبرت ناک انجام سے دوچار ہوں گے۔

○

حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے، مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: فلاں آدمی کی طرح نہ ہوجانا۔ وہ رات کو قیام کرتا تھا، پھر چھوڑ دیا۔ (نسائی، حدیث ۱۷۶۴)

جو عمل مسلسل ہو وہ خصوصی اثر رکھتا ہے۔ وہ تسلسل کی وجہ سے زیادہ بھی ہوجاتا ہے اور مداومت کی وجہ سے اس میں پختگی بھی پیدا ہوجاتی ہے۔ اس کی دنیاوی برکات و منافع بھی زیادہ ہوتے ہیں اور اجر بھی زیادہ ہوتا ہے۔ تہجد کی طرح باقی امورِ خیر کا بھی یہی حکم ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بہتر عمل وہ ہے جس پر مداومت کی جائے (یعنی مستقل کیا جائے) اگرچہ وہ تھوڑا ہو'۔

○

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ہاں تشریف لائے۔ آپؐ کے پاس ایک عورت تھی۔ آپؐ نے پوچھا: یہ کون ہے؟ انھوں نے جواب دیا: فلاں عورت ہے، اس کی نماز کا چرچا ہے۔ آپؐ نے فرمایا: اتنا عمل کرو جس کی تم طاقت رکھو۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ثواب دینے سے نہیں اُکتائیں گے لیکن تم اُکتا جاؤ گے۔ اور فرمایا: تمام طریقوں سے زیادہ محبوب طریقہ اللہ کے نزدیک وہ ہے جس پر آدمی مداومت کرے۔ (نسائی، حدیث ۵۰۳۸)

نماز اور تمام عبادات کے سلسلے میں اس اصول کی پابندی کی جائے تو اس کے نتیجے میں آدمی زیادہ عبادت گزار ہوجاتا ہے۔

○

حضرت ابوایوب انصاریؓ بیان کرتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو اللہ کی عبادت کرتے ہوئے آیا درآں حالیکہ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا اور نماز قائم کی اور زکوٰۃ دی

اور کبائر سے بچا، اس کے لیے جنت ہے۔ صحابہؓ نے کبائر کے متعلق پوچھا تو آپؐ نے فرمایا: شرک باللہ، مسلمان کو قتل کرنا اور میدانِ جنگ سے بھاگنا۔ (نسائی، حدیث ۴۰۱۴)

حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ جو شخص فرائض ادا کرے اور منکرات اور کبائر سے بچے، اس کے لیے جنت ہے۔ چند کبائر کا ذکر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بطورِ نمونہ فرمایا۔

○

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں تمھیں نہ پاؤں کہ میرے بعد کافر بن جاؤ، ایک دوسرے کی گردنیں اُڑانے لگو، آدمی کو اس کے باپ کے جرم اور بھائی کے جرم میں نہ پکڑا جائے گا۔ (نسائی، حدیث ۴۱۳۴)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد حجۃ الوداع کے موقعے پر تھا۔ اس حکم کی اہمیت کی خاطر اسے حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا گیا۔ آج اس حکم کی خلاف ورزی ہو رہی ہے۔ حجۃ الوداع کی اس وصیت کو اپنا نصب العین بنا کر اس کی تعمیل کرنا چاہیے اور اس کی خاطر اجتماعی کوشش کرنا چاہیے۔

○

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے ہمارے اُوپر اسلحہ لہرایا وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ (ابن ماجہ، ۲۵۷۷)

مسلمان کے خلاف اسلحہ لے کر نکلنا ایمان اور اسلام کے منافی ہے۔ جو مسلمان ہوگا وہ مسلمان کی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کرے گا۔ اس کا خون گرانے کے درپے نہ ہوگا۔

○

حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: صبح کے وقت تھوڑی دیر کے لیے فی سبیل اللہ نکلنا، اور شام کے وقت تھوڑی دیر کے لیے فی سبیل اللہ نکلنا، دنیا و مافیہا سے بہتر ہے۔ (ابن ماجہ، کتاب الجہاد، حدیث ۲۷۵۷)

یہ فضیلت قتال فی سبیل اللہ اور دعوت الی اللہ دونوں کو شامل ہے۔ اقامت دین کی جو جدوجہد کی جائے وہ دنیا و مافیہا سے بہتر ہوگی۔ اس لیے کہ اس کے عوض میں جنت ملے گی جو دنیا و مافیہا سے بہتر ہے۔

دنیا اور آخرت

خرم مرادؒ

اس دنیا میں ہماری زندگی ایک حقیقت ہے، اور جتنی بڑی حقیقت دنیا کی یہ زندگی ہے، اتنی بڑی حقیقت یہ ہے کہ اس زندگی کو لازماً ختم ہوجانا ہے۔ کسی بات کے بارے میں بھی بحث، گفتگو یا اختلاف ہوسکتا ہے، لیکن اس بارے میں کوئی اختلاف یا بحث کی گنجایش نہیں ہے کہ یہ زندگی ختم ہوگی ـــــ یہ بڑی واضح اور اٹل بات ہے۔ اور پھر جتنی بڑی حقیقت یہ ہے کہ یہ زندگی اللہ کی بخشی ہوئی ہے اور اسی نے اس کو پیدا کیا ہے، اتنی ہی بڑی حقیقت یہ بھی ہے کہ ہم اس کے سامنے حاضر ہوں گے۔ مخلوق کی خالق سے ملاقات ہوگی۔ اس سے ملاقات نہ ہو تو یہ سارا سلسلہ محض ایک واہمہ اور ایک تخیل بن کر رہ سکتا ہے ـــــ اللہ موجود ہے، وہ یہ سب کچھ دیکھ رہا ہے اور یہ کہ واقعی وہ ہے، اس کی آخری تصدیق اسی وقت ہوسکتی ہے جب اس سے ملاقات ہو۔ ساری زندگی اللہ کی بندگی اور اس کی غلامی میں گزارنے کے لازمی معنی یہ ہیں کہ موت کے بعد آنے والی زندگی میں اس سے ملاقات ہو، اور اس کی بندگی اور غلامی کی راہ میں جو ہماری کوششیں ہوں، ان کو وہ قبول فرمائے اور وہ اس کی خوشنودی اور اس کی رضامندی کی مستحق ٹھیریں۔ پس جو آدمی اللہ پر اور یومِ آخرت پر ایمان کا دعویٰ کرے، اس کو ان دونوں کو ملا کر چلنا ہوگا۔ اس لیے کہ اللہ پر ایمان کا دعویٰ آخرت کے یقین کے بغیر، عملی زندگی میں کوئی وزن نہیں رکھتا۔

یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم نے جس ہستی کو ہر جگہ محسوس کیا ہو، ہر جگہ پایا ہو، موت کے ساتھ ہی اچانک وہ ہم سے لاتعلق ہوجائے۔ اگر اللہ سے ملاقات، آنے والی زندگی، اس کا احتساب، اس کی رضا اور اس کا انعام، یہ ساری چیزیں حقیقت نہ ہوں تو پھر بندگی، اطاعت، اس کی راہ میں جان لڑانے

اور جہاد فی سبیل اللہ کے معنی کیا رہ جاتے ہیں، بلکہ وہ آدمی بڑا احمق ہے جو نیکی کرے اور یہ یقین نہ رکھتا ہو کہ آخرت میں اللہ سے ملاقات ہونی ہے، یعنی خدا کو مانتا ہو، آخرت کو نہ مانتا ہو۔ صاحبِ ایمان تو صاحبِ شعور بھی ہوتا ہے، اور ایمان کو بہرطور کامل ہونا چاہیے۔ یہی شعور کا تقاضا ہے۔۔۔ یہ بنیادی مقدمات ہیں، جنھیں ذہن میں صاف ہونا چاہیے۔

● **چند بنیادی پہلو**: اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ آخرت پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ دنیا کی ساری زندگی، یہاں کی ساری کوششوں، ہر چیز، ہر بات، ہر کاوش اور ہر قدم کا محور آخرت ہو۔ یہ ایمان بالآخرت ہے اور جتنا یہ ایمان مضبوط ہوگا، اتنا ہی اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہمارا تعلق بھی مضبوط ہوگا۔ خود اللہ تعالیٰ نے بار بار دونوں کو ایک دوسرے سے مربوط کیا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ عبادت، غلامی اور بندگی کی دعوت جہاں بھی آئی ہے اس میں آخرت کو مطلوب و مقصود قرار دینے اور اس کی کامیابی کو سمجھ کر جینے کی دعوت بھی شامل ہے۔ انبیا علیہم السلام کی ساری دعوت کا خلاصہ بھی یہی ہے کہ زندگی اگر غلامی میں بسر کرنا ہے تو یہ سمجھ کر بسر کرو کہ جب اس سے ملاقات ہوگی تو وہی اس فیصلے کا دن بھی ہوگا کہ ہم نے فی الواقع زندگی اس کی غلامی میں بسر کی یا نہیں۔

تیسری بات یہ ہے کہ ہمیں ایک مشکل کا سامنا ہے۔۔۔ دنیا ہماری نگاہوں کے سامنے ہے۔ اس کو ہم دیکھتے ہیں، محسوس کرتے ہیں۔ اس کی لذات سے ہم آگاہ ہیں۔ اس کی تکالیف سے اور درد اور الم کی کیفیات سے گزرتے ہیں۔ یہ ایسی حقیقتیں ہیں جن سے انکار ممکن نہیں ہے۔ آخرت ایک وعدہ ہے، نگاہوں سے اوجھل ہے۔ اس کی لذتیں ہم محسوس نہیں کرتے۔ دیکھتے نہیں، سنتے ہیں کہ وہ ایسی ہوں گی۔ اس کی تکلیفوں سے ہم واقف نہیں ہیں۔ اور یہ ہماری فطرت ہے کہ ہم کل کے اُوپر آج کو، دُور کے مقابلے میں قریب کو، اور غیر محسوس چیز کی جگہ محسوس چیز کو ترجیح دیتے ہیں اور اسی کو اختیار کرتے ہیں۔ یہ معاملہ دنیا اور آخرت کے بارے میں ہی نہیں ہے بلکہ خود دنیا میں ہمارا یہ حال ہوتا ہے کہ کل آنے والی چیز اور کچھ مدت بعد ملنے والی شے کو ہم ٹال دیتے ہیں اور جو چیز فوری طور پر مل رہی ہو، اس کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہ فی الحقیقت ہمارے امتحان کا ایک حصہ ہے۔

● **دنیا کو ترجیح دینا**: دنیا کی محبت، اس کے اُوپر راضی ہو جانا اور اسی کو مقصود بنانا ایک

ایسی بیماری ہے، جو اللہ کی راہ میں اُٹھنے والے ہر قدم اور کوشش کو گھُن کی طرح کھا جاتی ہے۔ یہ یقین کہ اللہ سے ملاقات ہونی ہے اور اسی کو مطلوب و مقصود بنانا ہے وہ چیز ہے جس سے ان سارے مراحل کو طے کرنے کے لیے، جو راہِ حق میں پیش آتے ہیں، صحیح قوت اور طاقت پیدا ہوتی ہے۔

یہ بیماری کہ آدمی دنیا کو ترجیح دے، دنیا سے محبت کرے، نقد کو حاصل کرے، اُدھار کو ٹال دے اور آج جو کچھ ہے اس کو قیمتی جانے، اور جو کچھ کل آنے والا ہے اس کو محسوس نہ کرے___ یہ جس طرح کافروں کے ساتھ لگی ہوئی ہے اسی طرح ان کے ساتھ بھی لگی رہتی ہے جو ایمان کی راہ پر آتے ہیں۔ ایک ہی دنیا ہے۔ کافر بھی اس میں رہتے ہیں اور مسلمان بھی اسی میں رہتے ہیں۔ دونوں کو ایک ہی قسم کے حالات سے سابقہ پیش آتا ہے۔

جہاں جہاں بھی مسلمان ایمان کے دعوے میں اور اس کے تقاضے پورے کرنے میں کمزوری دکھاتے ہیں وہاں اللہ تعالیٰ نے اس بیماری کی نشان دہی کر دی ہے۔ یہ دراصل دُکھتی رگ ہے اور ساری خرابیوں کی جڑ ہے۔ غزوۂ بدر ہوا تو فرمایا: تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا (الانفال ۸:۶۷) ''تم لوگ دنیا کے فائدے چاہتے ہو''۔ غزوۂ اُحد میں ڈسپلن کی کمزوری ظاہر ہوئی تو فرمایا: مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ، (اٰل عمرٰن ۳:۱۵۲) ''تم میں سے بعض دنیا کے طلب گار تھے اور بعض آخرت کے طلب گار تھے''۔ غزوۂ تبوک میں جن لوگوں نے کمزوری دکھائی ان کا ذکر سورۂ توبہ میں یوں ہوا: ''اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، تمھیں کیا ہوگیا کہ جب تم سے اللہ کی راہ میں نکلنے کے لیے کہا گیا تو تم زمین سے چمٹ کر رہ گئے؟ کیا تم نے آخرت کے مقابلے میں دنیا کی زندگی کو پسند کرلیا؟ ایسا ہے تو تمھیں معلوم ہو کہ دنیوی زندگی کا یہ سب سروسامان آخرت میں بہت تھوڑا نکلے گا'' (۹:۳۸)۔ گویا ہر جگہ ایک ہی بات کہی گئی۔ ایسے معاملات میں خرابی کی جڑ یہ دنیا کی محبت ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے بگڑی ہوئی مسلمان اُمتوں کو اپنی طرف بلایا تو اس میں اس بات کو بنیادی اہمیت دی کہ ہر وہ چیز جس سے آخرت میں اپنے اعمال کی جواب دہی کا احساس کمزور ہوتا ہو، یا جس سے دنیا کی محبت ظاہر ہوتی ہو، اس کو ختم کیا جائے، اس کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکا جائے۔

● **دعوت کا مرکزی نکتہ:** سارے پہلوؤں کو سامنے رکھیں تو یہ بات صاف اور واضح ہو جاتی ہے کہ حق کی راہ پر چلنے میں، خود اپنے لیے بھی اور دوسروں کے لیے بھی، ایک ہی چیز

مرکزی حیثیت رکھتی ہے اور اسی سے ہمارے اندر قوت، استقامت اور استعداد پیدا ہوگی کہ جن لوگوں کو ہم منظم کر کے اسلامی انقلاب کے لیے تیار کرنا چاہتے ہیں ان کے اندر دنیا کی محبت کم ہو، آخرت کی محبت اور آخرت کا خیال زیادہ ہو، اور جو موت سے خوف زدہ نہ ہوں۔

ہماری دعوت کے اندر اس کی حیثیت ایک مرکزی نکتے کی ہونی چاہیے۔ جب دنیا کی محبت دل سے نکل جائے گی اور آخرت کی طلب دل کے اندر ڈیرہ ڈال لے گی اور وہاں کی کامیابی ہی اصل کامیابی ٹھیرے گی تو ہمیں صحیح عمل کرنے کے لیے یقین اور قوت بھی حاصل ہوگی، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جن عوام کو ہم پکارتے ہیں اور جن کی عدم توجہی کی ہم شکایت کرتے ہیں، ان کے بھی سارے امراض کا علاج اسی میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے عوام کو بھی پکارا اور جب بھی پکارا تو یہی پکارا کہ وہ ایسے فریب اور دھوکے سے باہر نکل آئیں جو ان کو نیک عمل سے غافل کرتے ہیں۔

یہ حدیث آپ کی بار بار کی سنی ہوئی ہوگی جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرمایا ہے کہ ایک وقت آئے گا دنیا کی قومیں اس اُمت کے اُوپر اس طرح سے ٹوٹ پڑیں گی جس طرح سے بھوکے دسترخوان پر ٹوٹ پڑتے ہیں، تو صحابہؓ نے پوچھا کہ کیا ہم تعداد میں بہت کم ہوجائیں گے؟ آپؐ نے فرمایا: نہیں، تمھاری تعداد تو ریگستان کے ذروں اور درخت کے پتوں کی طرح ہوگی۔ انھوں نے کہا: پھر کیا وجہ ہوگی، تو آپؐ نے فرمایا: تمھارے اندر وہن پیدا ہوجائے گا۔ صحابہؓ نے پوچھا: وہن کیا ہوگا؟ آپؐ نے فرمایا: دنیا کی محبت اور موت سے نفرت___ گویا جب یہ پیدا ہوجائے تو انسانوں کی ساری استعداد اور قوت ختم ہوجاتی ہے، اور اگر انسان میں وہن نہ رہے تو اس کی جدوجہد اور اس کے عمل میں نئی زندگی پیدا ہوجاتی ہے۔ اس نکتے سے غافل ہوکر جو کوششیں ہوں گی، ہوسکتا ہے وہ پوری طرح بارآور نہ ہوں۔

● **آخرت کے لیے یکسوئی:** اس کی اہمیت سمجھ لینے کے بعد___ دوسری جس چیز کا مطالبہ ہے وہ یہ ہے کہ ہم آخرت کو یکسوئی کے ساتھ منتخب کریں، اور یکسوئی کے ساتھ اس کے حصول کا ارادہ کریں۔ دنیا اور آخرت دونوں میں سے کسی ایک کو آدمی منزل بنا سکتا ہے۔ دونوں کو ایک جیسا مقام نہیں دے سکتا۔ قرآن نے اس بات کو بہت واضح انداز میں کہا ہے کہ آدمی اپنے ارادوں کو کبھی دو حصوں میں نہیں بانٹ سکتا۔ وہ یہ نہیں کرسکتا کہ دونوں کو مقصود بنا کر چلے۔ قرآن نے کہا

ہے کہ جو آخرت کو مطلوب بنائے گا اس کو آخرت ملے گی، اور جو دنیا کو مقصود بنائے گا اس کو دنیا ملے گی اور آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہوگا۔ انسان دنیا اور آخرت کو بیک وقت مقصود بنا کر نہیں چل سکتا۔ دو کشتیوں میں پاؤں رکھ کر وہ زندگی کے سمندر میں تیر کر آخرت تک نہیں پہنچ سکتا۔

اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ جو آدمی آخرت کو مقصود بنائے وہ دنیا سے دست بردار ہو جائے گا___ مطلب یہ ہے کہ دنیا اس کے لیے مطلوب، محبوب اور مقصود کی حیثیت نہیں رکھے گی بلکہ یہ آخرت کو حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہوگی۔ اس کی رشتہ داریاں، اس کی دوستیاں، اس کی محبتیں، اس کی جدوجہد، سب ایک ذریعے کی حیثیت اختیار کر جائیں گی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اس کو بار بار واضح کیا ہے، مختلف مثالوں سے سمجھایا ہے۔ یہ جاننے کے باوجود کہ آخرت کو مطلوب ہونا چاہیے، کئی جگہ بتایا ہے کہ دنیا کی حقیقت کیا ہے، آخرت کی حقیقت کیا ہے، دنیا سے کیا ملتا ہے، آخرت کیا دیتی ہے، اور اس لیے ان دونوں میں سے کس چیز کو تمھیں اختیار کرنا چاہیے۔ دنیا کا نفع دنیا کی چیزیں ہیں، مثلاً مال، اولاد، جاہ و حشمت، مقبولیت۔ دوسری طرف آخرت کا فائدہ اللہ تعالیٰ کی رضا ہے، اور وہاں کا نقصان اس کی طرف سے دیا ہوا عذاب ہے۔

دنیا اور آخرت کی حقیقت کو اللہ تعالیٰ نے مختلف پہلوؤں سے واضح کیا ہے۔ ان میں پہلی بات یہ ہے کہ دنیا کی ہر چیز، نعمت ہو یا تکلیف، گزر جانے کی چیز ہے۔ چونکہ وقت نہیں ٹھیر سکتا، اس لیے تکلیف بھی نہیں ٹھیر سکتی اور آرام بھی نہیں ٹھیر سکتا۔ اب اس صورت میں کہ وقت کا گزرنا یا رُک جانا ہمارے بس میں نہیں ہے، ہم اس کو روک کے نہیں بیٹھ سکتے۔ اس لیے یہاں کی خوشی، یہاں کا آرام، یہاں کی تکلیف، یہاں کا الم، اور یہاں کا درد، یہ سب چیز گزر جانے والی ہیں۔ یہ ہمارا روز کا تجربہ ہے کہ خوشی کا بڑا انتظار رہتا ہے۔ ہم اس کی تمنا ہی نہیں کرتے، خواب دیکھتے ہیں۔ خوشی آتی ہے اور بالآخر گزر جاتی ہے۔ تکلیف سے ہم ڈرتے رہتے ہیں۔ تکلیف بڑھتی ہے اور پھر آہستہ آہستہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی اب گزر ہی جائے گی۔

● **ایک اٹل حقیقت**: دنیا کے ساتھ ایک عجیب معاملہ ہے کہ اس کی کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو ٹھیرنے والی ہو۔ ہر بات موت کے ساتھ بالکل ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گی۔ اس خاتمے کو ٹالا نہیں جا سکتا اور موت سب کے لیے ہے، کُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ (اٰل عمرٰن ۳:۱۸۵)۔

لیکن آخرت میں جو کچھ ہے، اس کا تعلق دنیا کے وقت سے نہیں ہے۔ اس کے وقت کا پیمانہ الگ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس سلسلے میں ہمیں ہماری زبان میں جو کچھ سمجھایا ہے اس میں اسی بات پر زور دیا ہے کہ وہاں کی ہر چیز باقی رہنے والی ہے، کبھی ختم ہونے والی نہیں ہے۔

دنیا کی مثال تفصیل کے ساتھ دو تین جگہ دی گئی ہے۔ ایک جگہ فرمایا کہ دنیا کی مثال ایک بارش کی سی ہے۔ بارش ہوتی ہے، فصل اُگتی ہے، ہری بھری ہوتی ہے، بہار آتی ہے، اس کے بعد زرد پڑتی ہے اور چورا چورا ہو کر زمین کے اندر مل جاتی ہے۔ سورۂ کہف میں، سورۂ حدید میں اور سورۂ یونس میں تین جگہ اس مثال کے مختلف پہلو مختلف انداز سے اُجاگر کیے گئے ہیں۔ ان سب میں یہی بتایا گیا ہے کہ جس طرح کھیتی باڑی ہوتی ہے، انسان کھیتی کرتا ہے، وہ کچھ نتائج دیکھتا ہے لیکن پھر بالآخر سب کچھ مٹی میں مل جاتا ہے۔ دنیا کے معاملات اسی طرح ہیں۔

آخرت کے بارے میں یہ بات بالکل صاف کہی گئی ہے کہ وہاں پر موت نہیں آئے گی۔ عذاب ہوگا تو وَ يَأْتِيهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّ مَا هُوَ بِمَيِّتٍ ؕ (ابراہیم ۱۴:۱۷)، یعنی وہ عذاب تو ایسا ہوگا کہ جیسے ہر طرف سے موت آرہی ہے مگر انسان مرنے نہ پائے گا۔ دنیا میں جب درد و الم بہت بڑھتا ہے تو آدمی یہ آرزو کرتا ہے کہ بس اب موت آجائے تاکہ یہ درد و الم ختم ہو اور موت آ بھی جاتی ہے، اور درد و الم ختم ہو بھی جاتا ہے۔ لیکن وہاں کا عالم ایسا ہے جو موت ہی کی طرح ہوگا کہ موت آرہی ہے، لیکن آدمی مرے گا نہیں۔ یہ عذاب کی بڑی تکلیف دہ صورت ہوگی۔ لیکن انعام پانے والے بھی ایک موت کے بعد کسی دوسری موت کا مزا نہیں چکھیں گے۔

● **یقینی نتائج**: دوسری بات جو اللہ تعالیٰ نے آخرت اور دنیا کے موازنے میں کہی ہے وہ یہ ہے کہ آخرت کے لیے کوشش کے نتائج یقینی ہیں۔ آخرت کے لیے کوشش رایگاں نہیں جاسکتی۔ اس کا کوئی امکان نہیں ہے کہ آدمی خلوص کے ساتھ آخرت کے لیے کوشش کرے اور وہ ضائع ہو جائے اور اس کا اجر اس کو نہ ملے۔ لیکن دنیا کا معاملہ یہ ہے کہ اس کی کوشش کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ آدمی بہت محنت کرے اور پھر بھی ممکن ہے کچھ حاصل نہ ہو، یا تھوڑی محنت کرے اور ممکن ہے بہت زیادہ مل جائے۔ یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ ہر آدمی جو کوشش کرے گا اس کو اس کا پھل ضرور ملے گا، بلکہ کسی کو مل سکتا ہے اور کسی کو نہیں ملے گا۔ گویا دنیا کے نتائج غیر یقینی بھی ہیں، کم اور زیادہ بھی

ہوسکتے ہیں، اور ہر شخص کو ملنا ضروری بھی نہیں ہیں۔ لیکن آخرت کے بارے میں یہ بات بالکل واضح اور صاف ہے کہ کسی شخص کا کوئی عمل ایسا نہیں ہے جو ضائع جائے گا، بلکہ ارشاد ہے کہ جو کچھ عمل ہوگا اس سے زیادہ کا بھی وعدہ ہے، ہماری طرف سے۔

● **کثرت کی ہوس**: اب ایک اور پہلو سے دیکھیں۔ سورۂ حدید میں ایک پوری آیت میں دنیا کو زینت بھی کہا گیا ہے، تکاثر بھی کہا گیا ہے۔ ان میں سے ہر لفظ کے اندر دنیا کے نتائج کی ایک قدر و قیمت کو واضح کیا گیا ہے۔ سجاوٹ اور زینت صرف ظاہری ہوتی ہے۔ آپ باہر سے ایک چیز کو سجاتے ہیں۔ سجاوٹ کے معنی یہ ہیں کہ ہوسکتا ہے کہ اندر سے اس کی کوئی حقیقت نہ ہو۔ زینت اس لیے کہا گیا ہے کہ یہ تو ظاہر کی سجاوٹ ہے۔ اچھا لباس ہے، اچھا مکان ہے، اچھی گاڑی ہے، یہ سب کچھ ہے، لیکن یہ سجاوٹ ہے۔ اس کی کوئی اندرونی قدر و قیمت نہیں ہے۔ تکاثر کے معنی یہ ہیں کہ اس میں ایک دوسرے کے ساتھ مسابقت ہے اور مسابقت کے ساتھ حسد اور جلن اور کش مکش کی جو برائیاں ہیں وہ بھی ساتھ ساتھ آتی ہیں۔ تکاثر کے معنی ہیں: زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کی ہوس۔ یہ دنیا کی بھوک ہے جس سے کبھی آدمی سیر نہیں ہوتا۔ یہ وہ پیاس ہے کہ ایک گھونٹ پی کر اور بڑھتی ہے، اور بڑھتی چلی جاتی ہے۔ چنانچہ آدمی اس کو اور حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

● **متاعِ غرور**: دنیا کے یہ مختلف پہلو یہاں کے نتائج اور ان کی قدر و قیمت کو واضح کرتے ہیں۔ قرآن حکیم انھی نتائج کو بیان کر کے تصریح کرتا ہے کہ یہ متاع ہے اور متاع الغرور ہے۔ غرور کے معنی دھوکے کے ہیں۔ سارے دھوکے اس کے اندر شامل ہیں۔ اس کے مقابلے میں آخرت کو خیر کہا ہے کہ یہ بہتر بھی ہے، باقی رہنے والی بھی ہے، اور یہاں خوف و حزن اور اَلم سے نجات بھی ہے۔ آخرت کے بارے میں وعدہ ہے کہ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَاهُمْ يَحْزَنُوْنَ (البقرہ ۲:۳۸) ''نہ ان پر خوف ہوگا نہ کسی قسم کے غم کا شکار ہوں گے''۔ اور نہ وہاں پر یہ مسابقت ہوگی کہ اس کو اتنا مل گیا۔ ایسی کوئی چیز مالک کی خوشنودی پانے والوں کے درمیان نہ ہوگی۔

قرآنِ مجید نے دنیا کو اس لحاظ سے اہم قرار دیا ہے کہ آخرت کی پوری راہ دنیا سے ہوکر جاتی ہے۔ یہی راہ، یہی مال، اور یہی نعمتیں آخرت کے حصول کا ذریعہ بن سکتی ہیں۔ اسی لیے دنیا کے مال کو خیر بھی کہا گیا۔ اس میں کوئی تضاد نہیں۔ اگر یہی مال آخرت بنانے کے لیے استعمال ہو تو یقیناً

وہ خیر ہے۔ گویا یہ دو دھاری تلوار ہے۔ جو اس کے پیچھے چلتا ہے وہ برباد ہو گیا، اور جس نے اس کو اپنے پیچھے چلایا اور آخرت کی منزل کی طرف لے گیا تو وہ کامیاب ہو گیا۔ جو انسان ان حقائق سے واقف ہو، اس کو اپنی منزلِ مقصود آخرت ہی کو قرار دینا چاہیے۔ لیکن اگر یہ سب کچھ چھوڑ کر آپ دنیا کو مقصود بنائیں اور اس کے پیچھے دوڑیں تو آپ خود ہی سوچیں کہ اس سے بڑی غلطی کیا ہو سکتی ہے۔

● **اس سے پہلے کہ موت آجائے!** اس کے ساتھ یہ بات بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ ہمیں دنیا استعمال کرنے کی جو مہلت ملی ہوئی ہے وہ ایک مختصر مہلت ہے۔ ایک تو یہ مختصر ہے اور دوسرے اس کے اختتام کا علم ہمیں نہیں ہے۔ یہ اختتام آج بھی ہو سکتا ہے اور کل بھی، برسوں بھی لگ سکتے ہیں اور دنوں میں بھی بات ختم ہو سکتی ہے۔ ماہ و سال کی جو مقدار بھی ہو، اس مدت کو مختصر ہی قرار دینا پڑتا ہے۔ لہٰذا نہ صرف یہ کہ یہ مدت مختصر ہے بلکہ ہمیں اس مختصر مدت کے نہ اختتام کا علم ہے اور نہ جگہ کا۔ موت کے بارے میں قرآنِ مجید نے جو تعلیمات دی ہیں، ان سے دراصل یہ بات واضح ہوتی ہے کہ موت ڈرنے اور خوف کھانے کے لیے نہیں ہے۔ بجائے اس کے کہ ہم موت سے ڈریں اور خوف کھائیں کہ جس سے ڈرنے اور خوف کھانے کا کوئی نتیجہ نہیں ہے، سوائے اس کے کہ بالآخر موت آئے گی، جو کچھ موت کے بعد پیش آنے والا ہے، ہم اس کی فکر کریں۔

یہاں جو بات کہی گئی ہے وہ یہ ہے کہ یہ مہلتِ عمل مختصر بھی ہے اور یہ بغیر کسی نوٹس کے ختم ہونے والی بھی ہے۔ اور یہ بھی دعوت دی گئی ہے کہ اس سے پہلے کہ وہ وقت آئے جب تم دنیا سے رخصت ہو، اس سے پہلے ہی اس کی تیاری کر لو۔ یہی دعوت اس انداز سے بھی دی گئی ہے کہ اس سے پہلے کہ تم کو پکڑ لیا جائے اور موت تمھارے اُوپر آ جائے، اس مہلت سے فائدہ اٹھا لو۔ اس لیے کہ اس کے بعد پھر کوئی اور عمل کی مہلت نہیں ہوگی۔

اگر آخرت مقصود بن جائے تو پوری دنیا کا رُخ متعین ہو جاتا ہے۔ شادی ہو، عائلی زندگی ہو، کیریئر ہو، اولاد ہو، کارخانے ہوں، کھیت ہوں، پیداوار ہو، تجارت اور مالِ تجارت ہو، بنک بیلنس ہو، سب چیزیں موجود ہوں گی اور آدمی کا ان سے تعلق بھی یقیناً ہوگا۔ لیکن اب سب سے برتر اور ہمیشہ باقی رہنے والی چیز ہی اس کی منزلِ مقصود ہوگی۔ یہی طاقت کا اصل سرچشمہ اور قوت کا اصل منبع ہے۔ (ایک خطاب کی تلخیص)

(کتابچہ منشورات سے دستیاب ہے، منصورہ، لاہور)

اسلامی تحریک کا داخلی استحکام اور تقاضے

محمد جعفر

تحریکوں اور تنظیموں پر جب ایک طویل مدت گزر جاتی ہے تو اُن کے اصل مقصد کے ساتھ دوسرے مقاصد بھی شامل ہوتے چلے جاتے ہیں۔ بعض اوقات تو صرف ڈھانچا رہ جاتا ہے، روح غائب ہوجاتی ہے۔ دستور میں درج شدہ نصب العین اور طریقۂ کار سے یا تو رشتہ کٹ جاتا ہے یا پھر کمزور ہوجاتا ہے۔ اگر یہ سانحہ فرد کے ساتھ ہو تو فرد ناکام ہوتا ہے اور اگر یہ حادثہ تحریک کے ساتھ ہو تو تحریک ناکام ہوتی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ وقتاً فوقتاً ہم جائزہ لیتے رہیں کہ جس تحریک سے ہم جڑے ہوئے ہیں، اس کے نصب العین سے ہمارا رشتہ کتنا اور کیسا ہے؟ یہی جائزہ اور احتساب ہمیں اور ہماری تحریک کو صحیح خطوط پر گامزن رکھ سکتا ہے۔

تحریک کا اوّلین تقاضا یہ ہے کہ اس کا ایک واضح نصب العین ہو، اور قائدین اور وابستگان کو اس کا صحیح شعور ہو۔ اسلامی تحریک میں لفظ 'اسلامی' اس تحریک کے نظریے (Ideology)، اس کے رُخ اور تحریک کے ہر پہلو (dimension) کی نشان دہی اور رہنمائی کرتا ہے۔ یہ تحریک اللہ کے بندوں کو ان کے رب سے جوڑتی ہے، اُسی کی رضاجوئی اور خوشنودی کے لیے جینے اور مرنے کا سبق سکھاتی ہے، اور اپنے جیسے انسانوں سے رشتے اور تعلّق کا پیمانہ اور اصول بتاتی ہے۔ ایک ایسے معاشرے کو وجود میں لاتی ہے، جس میں افراد صرف اپنی ہی فکر نہیں کرتے بلکہ موجود اور آنے والی نسلوں کو بھی اس راہ پر لگانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ تحریک ایسے ادارے اور نظامِ حیات کو وجود میں لاتی ہے، جس میں اس کے نظریے اور اصول کا غلبہ ہوتا ہے اور پوری انسانیت اس سے فیض یاب ہوتی ہے۔ انسان اپنے نفس اور اپنے جیسے انسانوں کی غلامی سے نجات پاتا ہے، اسے

سچّی آزادی اور ابدی راحت وسکون نصیب ہوتا ہے۔

یہ تحریک ایک ایسی انقلابی تحریک ہے، جو انسان کو اندر سے لے کر باہر تک بدل کر رکھ دیتی ہے۔ مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں سے اسے نکھارتی ہے۔ ایک اللہ کی بندگی، غیراللہ کا انکار، انبیاؑ کی غیرمشروط اطاعت اور دوسری تمام قیادتوں سے بغاوت اور ان کی اطاعت سے انکار اس کی انقلابیت کی روح ہے۔ اس روح کی برقراری و پرورش اصل داخلی استحکام ہے۔

● **دعوت: اہم ترین تقاضا**: تحریکِ اسلامی کا اہم ترین تقاضا دعوت ہے۔ کوئی اسلامی تحریک دعوت کا فریضہ انجام دیے بغیر اسلامی تحریک نہیں کہلاسکتی۔ دعوت نہ دی جائے تو لوگ جانیں گے کیسے؟ ساتھ کیسے آئیں گے؟ دین کیسے قائم ہوگا؟ اسے غلبہ کس طرح حاصل ہوگا اور اسلامی ریاست کس طرح قائم ہوگی؟ دعوت کے یہ مختلف پہلو اور مراحل ہیں۔ آغاز سے انجام تک ہر مرحلے میں اصل رول دعوت کا ہے۔ اس لیے دعوت غیرمعمولی اہمیّت کی حامل ہے: بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَ اِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ؕ (المائدہ ۵:۶۷) ”جو کچھ تمھارے رب کی طرف سے نازل کیا گیا ہے، وہ لوگوں کو پہنچا دو، اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اس کی پیغمبری کا حق ادا نہیں کیا“۔ اُمت کا مقصدِ وجود دنیا کے لوگوں پر دینِ حق کی گواہی ہے: وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ (البقرہ ۲:۱۴۳) ”اور اسی طرح تو ہم نے تم مسلمانوں کو ایک اُمتِ وسط بنایا ہے، تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو“۔

اس دعوت کا ایک پہلو جہاں یہ ہے کہ اللہ کی بندگی کا ماحول بنے، وہیں اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ انسانوں کی زندگی انصاف کے اُوپر قائم ہو: لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ (الحدید ۵۷:۲۵) ”ہم نے اپنے رسولوں کو صاف صاف نشانیوں اور ہدایات کے ساتھ بھیجا، اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں“۔ یہ نہایت اہم بات ہے۔ اس کو نظروں سے کبھی اوجھل نہیں ہونا چاہیے کہ یہ دین عدل وانصاف کے لیے آیا ہے اور یہ دنیا سچّے عدل وانصاف کی محتاج ہے۔

دعوت کے یہ وہ پہلو ہیں جو بنیادی اور مستقل نوعیت کے ہیں۔ یہ دعوت اور تحریک خلا میں

کام نہیں کرتی، بلکہ یہ ٹھوس زمین اور زندہ معاشرے میں کام کرتی ہے۔ اس لیے بندگیِ رب کی دعوت کے ساتھ ساتھ معاشرے کے زندہ مسائل میں دل چسپی رکھتی ہے اور انھیں حل کرنے کی کوشش بھی کرتی ہے۔ یہ تحریک ایک ہمہ گیر نوعیت کی تحریک ہے۔ اگرچہ ہم یہ ضرور چاہتے ہیں کہ علم عام ہو، لیکن اسلامی تحریک کسی مدرسے کا نام نہیں ہے۔ ہم نفوس کے تزکیے کو بنیادی اہمیت دیتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ تزکیہ ہو، لیکن اسلامی تحریک کسی خانقاہ کا نام نہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ اسلامی ریاست قائم ہو اور اقتدار صالحین کے ہاتھ میں ہو، لیکن اسلامی تحریک کسی مجرد سیاسی پارٹی کا نام نہیں۔ اسی طرح محض ادارے اور تنظیمیں بنانا اور ان کو چلاتے رہنا بھی اسلامی تحریک کا مقصد نہیں رہا ہے۔ اسلامی تحریک کا مقصد تو یہ ہے کہ اللہ کی بندگی قائم ہو اور لوگ اللہ کی خوشنودی حاصل کر کے آخرت کی کامیابی اور جنت کے مستحق بنیں۔ دنیا میں عدل وانصاف قائم ہو، لوگ امن وسکون اور خوش حالی وترقی سے ہم کنار ہوں۔ اگر تحصیل علم ہو تو اسی مقصد کے لیے، تزکیہ ہو تو اسی نصب العین کے لیے، سیاست ہو تو اسی لیے، اور اگر ادارہ بنایا جائے تو اسی غرض کے لیے الغرض اگر یہ ہمہ گیر مقصد سامنے ہو تو جزوی کام بھی اپنی جگہ پر ہو سکتے ہیں۔

● **جدوجہد کا مطلوب و مقصود:** ساری سرگرمیوں، تمام پروگراموں اور منصوبوں اور جدوجہد کا مقصود ومطلوب صرف رضائے الٰہی ہونا چاہیے۔ دعوت کا پھیلاؤ، اسلامی معاشرے کی تشکیل، اسلامی ریاست کے قیام کی کوشش اور ان سب کے لیے ایک مضبوط اجتماعیت کے استحکام کی حیثیت، تحریک کے ذرائع کی ہے۔ دنیا میں ایسی بہت سی تنظیمیں ہیں، جو تحریک بن کر نمودار ہوئیں بالآخر وہ صرف تنظیم اور سوسائٹی بن کر رہ گئیں۔ یہ ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی مقصود ومطلوب ہو اور اس کی رضا ہی محور ومحرک ہو اور یہ بات ہمیشہ سامنے رہنی چاہیے۔ یہی چیز دراصل متعین کرتی ہے کہ یہ تحریک کہاں تک اس مقصد کے حصول کے لیے سرگرمِ عمل اور مخلص ہے۔

جب انسان کے حوصلے صرف دُنیوی کامیابی کے ہونے یا نہ ہونے سے بلند اور پست ہونے لگیں تو اس کے معنی یہی ہیں کہ مقصود ومطلوب کے اندر فرق آ گیا ہے، اور اُسے اس پیمانے سے ناپا جاسکتا ہے کہ اس میں اسلامی تحریک کی خصوصیات موجود ہیں یا اس میں کوئی کمی واقع ہوگئی ہے۔ تحریک داخلی طور پر مستحکم ہے یا کمزور ہوئی ہے۔

فرد کا مقصود تو رضاے الٰہی اور فلاحِ اُخروی کا حصول ہے اور یہ ہمیشہ تازہ اور تابندہ رہنا چاہیے۔ لیکن جماعت اور تحریک کا مقصد یہ ہے کہ وہ افراد کی سعی و جہد کو اس طرح بروے کار لائے کہ فرد آخرت میں کامیاب ہو اور تحریک دنیا کے اندر کامیابی حاصل کرسکے۔ اس چیز کو قرآن نے 'فتح' کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ ''وہ تجارت جو تمھیں عذابِ الیم سے نجات دے'' کے مخاطب وہ افراد ہیں، جن کی آخری منزل جنت ہے۔ تحریک کی ذمہ داری محض اتنی نہیں ہے کہ وہ افراد تحریک کو اللہ کی رضا کی طلب میں مصروف دیکھ کر یہ سمجھ لے کہ اس کا کام پورا ہوگیا۔ تحریک کی ذمہ داری یہ بھی ہے کہ اپنے افراد و وسائل کو بہترین طریقے سے صرف کرے، تاکہ دنیا میں جسے 'فتح قریب' کہا گیا ہے، اس کے حاصل ہونے کے امکانات پیدا ہوجائیں۔ اللہ کا ارشاد ہے: وَاُخْرٰی تُحِبُّوْنَهَا ۭ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ ۭ (الصف ۶۱:۱۳) ''اور وہ دوسری چیز جو تم چاہتے ہو، (اللہ) وہ بھی تمھیں دے گا۔ اللہ کی طرف سے نصرت اور قریب ہی میں حاصل ہونے والی فتح''۔

اگر فرد اپنا سب کچھ اخلاص کے ساتھ اللہ کی راہ میں لگا دے، لیکن جماعت اپنی منزل تک نہ پہنچ سکے تب بھی فرد کامیاب ہے۔ لیکن اگر فرد کی نیت خالص نہ ہو تو جماعت و تحریک اگر اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہوجائے تب بھی فرد ناکام و نامراد ہے۔ اگر ہم نے کامیابی کے ان دونوں معیاروں کو اپنے سامنے رکھا تو داخلی استحکام کے تعلق سے اپنے جائزے اور احتساب میں ہمیشہ آسانی ہوگی، بلکہ سچی بات یہ ہے کہ جائزہ اور احتساب کا صحیح رُخ یہی ہے۔ اگر رضاے الٰہی کے مقصد کے شعور اور وابستگی میں نقص ہے تو فرد خواہ کتنے ہی نعرے لگائے، جلسے کرلے، تقریریں کرلے، پوسٹر لگالے، خدمت خلق کرے، بہرحال وہ ناکام ہوگا۔ اسی طرح جماعت کی حیثیت سے افراد کتنا ہی اچھا کام کررہے ہوں، وہ قربانی کے جذبے سے بھی سرشار ہوں، اور نظم و ضبط کے بھی پابند ہوں، لیکن جماعت اگر افراد کے جذبے کو صحیح راہوں پر، صحیح حکمت عملی سے، صحیح رُخ پر نہ لگائے تو بہرحال جماعت اس دنیا کے اندر ناکام ہوگی۔ ممکن ہے کہ جماعت کے قائدین اس بات کے ذمہ دار ٹھیریں کہ انھوں نے کیوں ان وسائل و ذرائع کو ضائع کیا اور صحیح مصرف میں نہیں لگایا۔

● **فرد اور جماعت میں توازن:** اسلامی تحریک میں 'فرد' اور 'جماعت' دونوں ہی اہمیت رکھتے ہیں۔ آخرت کی کامیابی کے لحاظ سے 'فرد' ہی اصل ہیں۔ اس لیے 'جماعت' کی تمام کوششوں

کو اس بات پر مرکوز ہونا چاہیے کہ فرد کے لیے ایسے مواقع اور امکانات پیدا ہوں، جن سے وہ اپنے اس مقصد کو حاصل کر سکے۔

انسانی زندگی باہمی تعلقات کا مجموعہ ہے اور نام ہے معاشرے اور جماعت کا۔ اس لیے جماعت کے بغیر انسان اپنے مقصد کو حاصل نہیں کرسکتا۔ جماعت نظم اور ڈسپلن کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی۔ نظم اور ڈسپلن کی پابندی سے فرد کی آزادی پر پابندیاں عائد ہوتی ہیں۔ دوسری طرف فرد کی تعمیر و ترقی میں اس کی آزادی اور اختلاف راے کا حق بہت معاون ہوتا ہے اور انھی دونوں کے درمیان تصادم و تنازعات پیدا ہوتے ہیں۔ اس کا حل یہی ہے کہ فرد اور جماعت اپنی کوششوں سے مستقل طور پر اس میں توازن پیدا کرتے رہیں۔ فرد اتنا آزاد نہ ہوجائے کہ نظم و ضبط برقرار نہ رہ سکے اور نظم وضبط اتنا سخت نہ ہوجائے کہ فرد کی آزادی پر قدغن لگ جائے۔

● **افراد کی تیاری:** تحریک کے ہمہ جہت تقاضوں کی تکمیل کے لیے مناسب حال افراد کی فراہمی ناگزیر ہے۔ فرد کی تعمیر اور اس کے ارتقا میں ایک صالح اور مضبوط اجتماعیت کا رول بڑا اہم ہے۔ ایک خوش گوار اور مضبوط اجتماعیت میں باہمی اخوت و خیر خواہی، سمع و طاعت، شوریٰ و احتساب اور نظم و ضبط اہم ستون کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ سب باہم ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ سمع و طاعت کا نظام باہمی اخوت و خیر خواہی کی بنیاد پر ہی مستحکم ہوتا ہے۔ دوسری طرف سمع و طاعت کے لیے شورائی نظام کا بہتر اور خوش گوار ہونا بھی ضروری ہے۔ نظم وضبط کی بہتری کے لیے احتساب کا عمل برقرار رہنا چاہیے اور نظم و ضبط کے استحکام کے لیے سمع و طاعت کے نظام کا چست ہونا ضروری ہے۔ اس سارے عمل (process) میں فرد کا رول کلیدی ہوتا ہے اور افراد کی تیاری اور ان کے ارتقا کے لیے ان کا اس عمل سے متعلق ہونا اور مستقل گزرتے رہنا بھی ضروری ہے۔

● **مؤثر تنظیم:** اسلامی اجتماعیت کا قیام یوں تو خود ہی ایک دینی فریضہ ہے لیکن اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لیے بھی اسلامی اجتماعیت ناگزیر ہے۔ اس کا شمار بھی اہم ترین تحریکی تقاضوں میں ہوتا ہے، کیوں کہ ہمہ جہت تحریکی تقاضوں کی تکمیل کے لیے جن اخلاقی اوصاف اور صلاحیتوں کے افراد کی ضرورت ہوتی ہے وہ ایک اسلامی اجتماعیت میں ہی پروان چڑھتے ہیں۔

اقامت دین کا فریضہ ہر مسلمان پر فرض ہے اور یہ فریضہ تنظیم اور اجتماعی زندگی کے بغیر ادا

نہیں ہوسکتا۔ اسلامی انقلاب کا کام تنظیم کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اس لیے دینی وتحریکی لحاظ سے جماعت کی جو اہمیت ہے وہ ہمارے ذہنوں میں محفوظ رہنی چاہیے۔ افراد کی قوتیں، طاقتیں اور صلاحیتیں تنظیم میں جمع ہوکر کئی گنا بڑھ جاتی ہیں۔ یہاں ایک اور ایک دو نہیں بلکہ ایک اور ایک گیارہ ہوجاتے ہیں۔ اس لیے مختلف قوتوں اور صلاحیتوں کے حامل افراد اگر الگ الگ ہوں تو وہ کارنامہ انجام نہیں دے پاتے، جو ایک اجتماعیت میں باہم مل کر انجام دے جاتے ہیں۔ جماعت کا کام یہ ہے کہ وہ خواب کو حقیقت بنائے۔ تمناؤں اور آرزوؤں کے حصول کو ممکن بنائے۔ جو چیز اُسے ناممکن نظر آتی ہو، وہ ممکن بن جائے اور حقیقت کا روپ دھار لے۔

تنظیم کا کام زیادہ تیز رفتاری سے ہونا چاہیے۔ جتنی تیز رفتاری سے کام ہوگا، تنظیم اتنی ہی مؤثر سمجھی جائے گی۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ہماری تحریک ہمہ جہت تحریک ہے، اس لیے اس کے کام کی رفتار کم معلوم ہوتی ہے۔ کچھ کہتے ہیں کہ ایک فرد کا ذاتی کام ہوتو وہ جلد انجام پاتا ہے اور زیادہ نفع بخش ہوتا ہے۔ جماعت کا کام سُست بھی ہوتا ہے اور اس میں خسارہ بھی زیادہ ہوتا ہے۔ اس طرح کی سوچ پیشۂ تدریس سے وابستہ لوگوں کی ہوتی ہے یا کاروباری لوگوں کی۔ صحیح بات یہ ہے کہ اس طرح کی صورت حال اسی تنظیم یا جماعت کی ہوتی ہے جو داخلی طور پر مستحکم نہیں ہوتی۔ تجزیہ ہمیشہ حقیقت پسندانہ ہونا چاہیے۔ خوش فہمی اور قنوطیت سے بچنا چاہیے۔ حقیقت پسند تجزیہ بتاتا ہے کہ تنظیم اگر مستحکم ہوتو کم سے کم محنت اور کم سے کم خرچ سے زیادہ سے زیادہ نفع حاصل ہوتا ہے۔ بڑی سے بڑی صلاحیت رکھنے والا فرد بھی بڑا سرمایہ لگاکر وہ نتیجہ حاصل نہیں کرسکتا جو ایک مؤثر اور کارگر تنظیم کرتی ہے کیونکہ یہاں تھوڑی سی محنت اور سرمایہ جمع ہوکر غیرمعمولی اور بابرکت ثابت ہوتے ہیں۔ اسلامی تحریک کا اصل سرمایہ اس کا عقیدہ، اس کا اخلاقی نظام اور اس کے افراد کا باہم شیروشکر اور ایک دوسرے کے لیے محبت وایثار کا پیکر ہونا، اور اپنے دین وتحریک کے لیے قربان ہونے کا جذبہ ہوتا ہے۔ اس کے اثرات ونتائج کا مقابلہ فرد اور افراد الگ الگ نہیں کرسکتے۔ اگر تنظیم مؤثر نہ ہو اور اسے وہ حکمت میسر نہ ہو، جس سے تنظیم کو مؤثر بنایا جاسکتا ہے تو اس کا امکان ہے کہ وسائل تو موجود ہوں، افراد بھی میسر ہوں، بھاگ دوڑ اور کوششیں بھی جاری ہوں، اس کے باوجود نفع حاصل نہ ہوسکے۔

اسلامی تحریک کی کامیابی کے لیے ایسی تنظیم کارگر نہیں ہوسکتی ہے جو صرف چلتے ہوئے

کاموں اور اداروں کو چلاتی رہتی ہو، بلکہ اسے ایسی تنظیم درکار ہوتی ہے جو رسمی امور پر قناعت کرنے سے زیادہ ارتقا اور پیش رفت پر نظر رکھتی ہو۔ اس کے پیش نظر معاشرے کو مسخر کر کے اس پر غلبہ حاصل کرنا ہوتا ہے۔ اگر تحریک اپنے مقصد کو حاصل کرلے یا کامیابی کے قریب پہنچے تو وہ کارگر کہلائے گی۔ لیکن اگر تحریکی تنظیم یا جماعت انسانی وسائل کو اسلامی انقلاب کی منزل قریب لانے میں نہیں لگا پاتی ہے تو اپنی کوتاہی سے ان وسائل اور اوقات کو ضائع کرتی ہے۔ ان کی قوتوں اور صلاحیتوں کو کم تر کاموں اور مقاصد میں لگاتی ہے تو یہ ایک غیر مؤثر اور غیر کارگر تنظیم کہلائے گی۔ اس لیے تنظیم کے لیے اس کا وہ نصب العین اس کی روح کی حیثیت رکھتا ہے، جو ہمیشہ شعور میں واضح رہے، نگاہیں اسی پر مرکوز رہیں اور تمام وسائل، اقدامات اور مساعی اسی کے لیے ہوں۔

تحریکی تنظیم کے لیے وہی کام اصل کام ہے، جو آنے والے کل کی تشکیل، اس کے منصوبے اور اس کے مقاصد کے مطابق کر سکے۔ ورنہ تحریک ہمیشہ آج ہی میں گردش کرتی رہے گی اور کل کبھی نہیں آئے گی۔ ہماری ہر پالیسی، ہمارے ہر فیصلے، ہمارا ہر اقدام، ہمارے ہر ضابطے اور دستور کی ہر شق کو اسی کل (مستقبل) کے لیے ہی وقف ہونا چاہیے۔ جس طرح ایک فرد کی زندگی میں وہی کام کارگر ہے جو آخرت میں نافع ہو، اسی طرح تنظیم کو بھی اپنے کام، فیصلے اور اقدامات وہی کرنے چاہییں جو کل کے لیے نفع بخش ہوں۔

فرد ہو یا تنظیم، اس کا صرف متحرک ہونا یا نظر آنا کافی نہیں۔ فرد کی اُخروی کامیابی اور تنظیم کی نصب العین سے قربت اور معاشرے پر اس کے مثبت اثرات کا ہونا ضروری ہے۔ اجتماع میں لوگوں کی کثرت، تربیت گاہ میں بڑے بڑے پروگرام کا انعقاد، اخبارات و رسائل کی اشاعت میں اضافے پر تحریک کو مطمئن نہیں ہونا چاہیے۔ اس کے لیے اطمینان کی بات اس وقت ہو سکتی ہے، جب نتائج معاشرے کے اندر سے نمودار ہوں۔ معاشرے میں دعوت کتنی مقبول ہو رہی ہے، نصب العین کو اپنانے والے کتنا آگے آرہے ہیں، ملت کے اندر نصب العین کے شعور کی بیداری کی رفتار کیا ہے؟ تعلیم یافتہ طبقے نے کتنا اثر قبول کیا؟ عوام میں کتنا نفوذ ہوا؟ نوجوانوں کی کتنی ذہن سازی ہوئی اور وہ کس قدر تحریک کے دست و بازو بنے؟ حکومت کے ایوانوں میں کتنی کھلبلی مچی؟ تحریک کو سمجھ کر کتنی آوازیں حمایت میں اور کتنی مخالفت میں اُٹھنے لگیں؟ میڈیا کی نگاہیں کتنا پیچھا کرنے لگیں؟

اور جن افراد کی تربیت کی جارہی ہے انھوں نے ان محاذوں پر کتنے جوہر دکھائے؟ ان تمام پہلوؤں کا جائزہ بتائے گا کہ تحریک اپنے مقصد سے کتنا قریب اور اس کا داخلی نظام کتنا مؤثر اور مستحکم ہے۔

● **تحریک کو مقصد نہ بننے دیں:** تحریک کا ایک اہم تقاضا یہ بھی ہے کہ تنظیم کو خود مقصد نہ بننے دیا جائے، ورنہ اصل مقصد میں آمیزش ہوسکتی ہے، تبدیلی بھی آسکتی ہے، اور اصل مقصد نگاہوں سے اوجھل بھی ہوسکتا ہے۔ معاشرے کو مسخر کرنا اور اسلامی انقلاب کی منزل کو قریب لانا اس جماعت کا اصل مقصد ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ہماری طاقت اور وسائل کا بڑا حصہ تنظیم میں لگ جائے۔ یہ خطرہ ایک دینی جماعت کو لاحق ہوسکتا ہے۔ کیونکہ اسلامی جماعت کا قیام بذاتِ خود بھی ایک مقدس دینی فریضہ ہوتا ہے۔ جب افراد کم ہوتے ہیں تو ان کے اوقات اور صلاحیتوں کا قلیل حصہ تنظیم پر لگتا ہے اور بڑا حصہ دعوت کی توسیع اور مقصد کے غلبے کی کوشش میں صرف ہوتا ہے۔ لیکن جیسے جیسے افراد میں اضافہ ہوتا ہے، تناسب بدلتا جاتا ہے۔ تنظیم بڑھے گی تو اس پر زیادہ قوت اور وسائل یقیناً لگیں گے، لیکن انھیں فطری مقام سے ہٹنا نہیں چاہیے۔ کیونکہ فطری تناسب برقرار نہ رہنے سے تنظیم بوجھل ہونے لگتی ہے اور اس کی تاثیر میں کمی واقع ہونا شروع ہوجاتی ہے۔

انسان کے اوقات اور صلاحیتیں ان چیزوں میں شامل ہیں جن سے تحریک پھیلتی اور معاشرے کو مسخر کرتی ہے۔ ان کا بڑا حصہ انھی کاموں پر صرف ہونا چاہیے۔ اگر ان کا بڑا حصہ تنظیم پر خرچ ہونے لگے تو اس خوش فہمی کا شکار نہیں ہونا چاہیے کہ داخلی استحکام پر زیادہ قوت صرف کی جارہی ہے، کیونکہ اس خوش فہمی کے نتیجے میں تحریک کی معاشرے کو مسخر کرنے کی قوت کم ہوجاتی ہے۔ لہٰذا ایسی کوشش ہونی چاہیے کہ اپنی قوت کا استعمال متناسب ہو۔ اس کا کوئی متعین فارمولا پیش نہیں کیا جاسکتا۔ قیادت اور افراد جماعت کی سوجھ بوجھ اور تجربے سے ہی اسے درست کیا جاسکتا ہے۔ داخلی استحکام کا اہم تقاضا ہے کہ اس مسئلے پر خصوصی توجہ صرف کی جائے____ گہرائی سے اس بات کا جائزہ لینا ہوگا کہ ہمارے اوقات، وسائل اور صلاحیتوں کا کتنا بہتر استعمال ہو رہا ہے۔ بہت سارے کام جو ہم کر رہے ہیں وہ کیوں کر رہے ہیں، اور ان سے کیا حاصل ہو رہا ہے؟ نصب العین کی طرف پیش قدمی میں ان سے کیا مدد مل رہی ہے؟ اگر ہم نے اس جائزے کی روشنی میں تحریک اور تنظیم کے تناسب کو درست کرلیا تو ان شاء اللہ تحریک داخلی طور پر مستحکم بھی ہوگی اور منزل کی طرف

پیش قدمی میں تیزی بھی آئے گی۔

● **مؤثر منصوبہ بندی:** تحریک کی پیش قدمی کے لیے بہتر منصوبہ بندی بھی ضروری ہے۔ خواہشوں اور تمناؤں کا نام 'منصوبہ' نہیں ہے۔ نئے پرانے کاموں کی 'فہرست مرتب' کرنا بھی منصوبہ نہیں۔ منصوبہ اس چیز کو کہتے ہیں جو واضح طور پر طے کرے کہ کیا کرنا ہے اور کس طرح کرنا ہے؟ کون سے وسائل درکار ہوں گے اور کہاں سے فراہم ہوں گے؟ منصوبہ اس بات کا نام ہے کہ آج وہ کون سا کام کیا جائے، جس سے مستقبل ہماری مرضی کے مطابق ہو جائے۔ منصوبہ بندی کے لیے مستقبل کا اندازہ لازمی اور ناگزیر ہے۔ کُل کام کا اندازہ بھی ضروری ہے۔ کام کا جو ہدف ہے اس میں سے جو ممکن ہے اس کا بھی اندازہ ہونا چاہیے۔ اہداف بڑے اور بلند ہونے چاہییں، البتہ ترجیحات کا قائم کرنا بہت ضروری ہے۔ ترجیحات کو ملحوظ رکھے بغیر اگر ہر اچھے کام کو بڑا ضروری اور وقت کا تقاضا سمجھ کر کرنے لگے تو کاموں کا بوجھ جماعت کو بوجھل اور غیر مؤثر بنا دے گا۔ ہر کام جو پسند آجائے کر لینے کا نہیں ہوتا۔ ہم کسی کام کو اس وقت تک ہاتھ میں نہیں لے سکتے، جب تک کہ اس کے مناسب حال ذرائع اور افراد میسر نہ ہوں۔ ترجیحات قائم کرنے کے لیے یہ فیصلہ ضروری ہے۔ فیصلے اگر ناقابلِ عمل ہوں تو رودادوں اور فائلوں کی زینت بنے رہتے ہیں، عملی جامہ نہیں پہنتے۔

● **کمزوریوں کی بروقت گرفت:** جماعت جب پھیلتی اور بڑھتی ہے تو افراد مسائل بھی پیدا کرتے ہیں۔ اسی کے نتیجے میں مختلف قسم کی کمزوریاں سامنے آتی ہیں۔ کمزوریوں پر قابو پانے کی کوشش بروقت ہونی چاہیے اور ایک حد تک ہی ہونی چاہیے۔ نہ مسائل کو پال کر رکھنا چاہیے اور نہ ایسے افراد کے پیچھے اپنا وقت ضائع کرتے رہنا چاہیے۔ انسانوں کی جماعت کبھی بھی تمام کمزوریوں سے پاک نہیں ہو سکتی۔ اس لیے اندیشوں کا اسیر بننے سے زیادہ امکانات پر نظر رہنی چاہیے۔ ایک فرد اگر اصلاح قبول کرنے کو تیار نہیں ہوتا تو اسی فرد کے پیچھے لگے رہنے کے بجائے بہتر افراد کو اپنانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ خوش گوار اور تازہ ہوا کے جھونکے اندر کی ناخوش گوار فضا کو صحت بخش بنا دیتے ہیں۔

● **بوجھل تنظیم:** تنظیم کو بوجھل نہیں بنانا چاہیے۔ ہلکی پھلکی چیز تیز رفتاری کے ساتھ آگے بڑھتی ہے اور بھاری بھرکم چیز کے لیے چلنا دشوار ہوتا ہے۔ اس کے اندر مسائل اور امراض

بھی زیادہ ہوتے ہیں۔ اچھی چیز اگر ضرورت سے زیادہ کھائی جائے تو موٹاپا بڑھتا ہے اور صحت خراب ہوجاتی ہے۔ اجتماعات تنظیم کے لیے ضروری ہیں۔ اگر سر جوڑ کر نہ بیٹھیں گے تو تنظیمی زندگی پیدا نہیں ہوسکتی۔ لیکن اجتماعات کی کثرت تنظیم کو بوجھل بناتی ہے، اس لیے اجتماعات کی کثرت پر قابو پانا چاہیے۔ مسائل کے حل کے لیے کمیٹیاں بھی ضروری اور مفید ہوتی ہیں، لیکن ان کی کثرت بھی تنظیم کو بوجھل بناتی ہے۔ اس لیے جو کام افراد کر سکتے ہیں، انھیں کمیٹیوں کے حوالے نہیں کرنا چاہیے۔

● **وقت، سب سے قیمتی سرمایہ:** سب سے زیادہ قیمتی سرمایہ وقت ہے۔ افراد کے وقت کے استعمال میں اس کی افادیت پر نظر رہنی چاہیے۔ پیسہ اگر زیادہ خرچ ہوجائے یا ضائع ہوجائے تو دوبارہ آنے کا امکان ہوتا ہے، لیکن وقت دوبارہ ہاتھ نہیں آتا۔ روٹین کی تکمیل اور منصوبوں میں درج پروگرام کی انجام دہی کے لیے اجتماعات وغیرہ کا انعقاد یہ دیکھے بغیر کہ کیا فی الوقت اس کی کوئی ضرورت یا افادیت ہے؟ وقت، مال اور صلاحیت کے زیاں کا سبب بنتا ہے۔

● **نئی راہیں تلاش کرنا:** انسان کو اللہ تعالیٰ نے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت دی ہے، اس صلاحیت کا استعمال ضروری ہے۔ نئی راہوں کی تلاش، نئی صورت حال پیدا ہو تو اس سے نمٹنے کے لیے نئی منصوبہ بندی، پرانے مسائل سے نمٹنے کے لیے ایسی راہ تلاش کرنا کہ اس پر بار بار وقت ضائع نہ کرنا پڑے، معاشرے میں اپنا وجود محسوس کرانے کی تدابیر پر غور کرتے رہنا اور نئے تجربات کرنا، مرعوبیت و نقالی سے بچنا اور خود اعتمادی کے ساتھ آگے بڑھنا ـــــ تحریکی افراد کا خاصا ہوتا ہے۔ ایسے ہی افراد سے تنظیم میں جان پیدا ہوتی ہے اور تحریک آگے بڑھتی ہے۔

● **منصب اور بہتر کارکردگی:** تحریک کا ہر کارکن اپنے معاشرے میں دوسرے لوگوں کے لیے ذمے دار اور ان کا قائد ہوتا ہے، اس لیے اسے اپنی ذات اور اپنی کارکردگی کو بہتر بنانے کے لیے فکرمند اور کوشاں ہونا چاہیے۔ جو شخص تحریک کے کسی ذمے دار منصب پر فائز ہوا سے اور بھی اپنی کارکردگی کو بہتر بنانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ سب سے پہلی چیز ذمے داری کا احساس ہے۔ کسی منصب پر فائز ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اسے اقتدار حاصل ہوا ہے اور جو لوگ اس کے ساتھ چل رہے ہیں، وہ سب اس کے ماتحت ہیں، بلکہ صورت حال یہ ہے کہ وہ ان سب کا، ان کی اصلاح و تربیت کا اور ان کی خیر خواہی کا ذمے دار ہے۔ اُن کے ذاتی، گھریلو اور اجتماعی مسائل کا

ذمے دار ہے اور ان سب سے بڑھ کر خود اپنی ذات کی اصلاح و تربیت کے لیے بھی ذمے دار ہے۔ اگر ایسی سوچ اور ایسا طرزِ عمل وہ اختیار کرتا ہے تو اس کے ساتھ چلنے والے افراد بھی اپنے شعبے میں یا اپنے ادارے میں یا اپنے محلے اور علاقے میں موجود افراد کے درمیان اسی روش پر چلیں گے، اور اپنے دعوتی فرائض کو ادا کرتے ہوئے اپنی ذات کے تزکیے و تربیت کی فکر زیادہ کریں گے۔

ذمے داری چھوٹی ہو یا بڑی، یہ اسی عظیم الشان ذمے داری کا ایک حصّہ ہے، جسے شہادت علی الناس کہا گیا ہے۔ جماعت نے جو دائرہ بھی طے کر دیا ہے، اس کے لحاظ سے اسے اپنی ذمہ داری کا جائزہ لینا چاہیے کہ وہ کہاں تک اسے ادا کر رہا ہے۔ اسے اِس بات کا بھی احساس ہونا چاہیے کہ اپنے ہر عمل کے سلسلے میں وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہ ہے۔ اگر خلقِ خدا کی نگاہوں سے بچ بھی گیا تو اللہ تعالیٰ کی نگاہوں سے وہ نہیں بچ سکے گا۔

اسلامی تحریک میں منصب کی طلب تو کجا اس کا خواہش مند ہونا بھی بڑے خسارے کا سودا ہے۔ یہ خودکشی کا اقدام ہے، جو یقیناً حرام ہے۔ لیکن اگر کوئی منصب یا ذمے داری بغیر کسی خواہش اور طلب کے کسی کے حوالے کی جائے تو اسے اللہ پر اور اس کی نصرت و تائید پر اعتماد کر کے خود اعتمادی کے ساتھ اسے قبول کرنا چاہیے اور بہتر سے بہتر انداز میں اس کی ادائی کے لیے اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرتے رہنا چاہیے۔ اُسے چاہیے کہ وہ اپنے لیے بھی روئے اور گڑگڑائے اور دعائیں کرے اور اپنے اُن رفقا کے لیے بھی گڑگڑا کر دعائیں کرے جو اس کے ساتھ کام کر رہے ہیں۔ یہ خیرخواہی اور اخوت اسلامی کا عین تقاضا ہے۔

ذمے دار کو چاہیے کہ وہ اپنی اور اپنے ساتھیوں کی صلاحیتوں کا صحیح ادراک کرے اور اپنے رفقا میں کام کی تقسیم ان کی صلاحیتوں کے اعتبار سے کرے۔ ایک اچھی ٹیم کے افراد کی گرچہ یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ انھیں جو کام بھی تفویض کیا جائے، اسے ذمے دارانہ طور پر انجام دینے اور کامیاب بنانے کی کوشش کریں، خواہ وہ کام ان کی پسند کا ہو یا نہ ہو۔ لیکن ایک صحت مند اور خوش گوار اجتماعیت کے لیے بہتر یہی ہے کہ صلاحیتوں کے اعتبار سے ہی کام تقسیم کیے جائیں اور ہر فرد کی اس کے کام کی مناسبت سے تربیت کی جائے اور صلاحیتوں کو پروان چڑھایا جائے۔

- **مشاورت کی روح**: بہتر منصوبہ بندی اور کارکردگی کے لیے شورائی نظام کا بہتر ہونا

بھی ضروری ہے۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ ذمے دار کیسا ہی سمجھ دار اور ذہین ہو لیکن عقلِ کُل نہیں ہوسکتا۔ ٹیم کے افراد کے فکروفہم سے استفادہ کیا جائے تو کارکنوں میں خوداعتمادی پیدا ہوتی ہے۔ اجتماعیت پر بھی اعتماد راسخ ہوتا ہے اور ٹیم میں اپنائیت کا احساس بڑھتا ہے، جو اجتماعیت کا بڑا سرمایہ ہے۔ مشوروں کی روشنی میں فیصلے خواہ اتفاق راے سے ہوں یا کثرت آرا سے یا ذمے دار کی صواب دید سے، ان کا احترام ضروری ہے۔ اس صحت مند روایت کو برقرار رکھنے کے لیے شورائیت میں شفافیت کا لحاظ بھی ضروری ہے۔

● **خیر خواہی اور احتساب**: اگر ذمے دار جماعت اپنے رفقا کا خیر خواہ ہو اور اس کا طرزِ عمل اس کا گواہ ہو تو سمع و طاعت اور نظم وضبط کا معاملہ بڑی حد تک درست رہتا ہے۔ اگرچہ اسلامی اجتماعیت سمع و طاعت اور نظم وضبط کو ذمے دار کے رویے سے مشروط نہیں کرتی، لیکن مضبوط اجتماعیت کے لیے ذمے دار اور قائد کا رول اور رویہ غیر معمولی اہمیّت کا حامل ہوتا ہے۔ تحریکِ اسلامی میں قائد اور ذمے داروں سے قربت، محبت اور فدائیت درکار ہوتی ہے اور ان چیزوں کا انحصار قائد اور ذمے دار کی خوے دل نوازی پر ہے۔ قائد اور ذمے دار کی رفقا سے خیر خواہی، محبت اور ایثار، رفقا کے اندر بھی اپنے قائد اور ذمے دار کے لیے محبت، احترام، قربانی اور ان کی اطاعت کا جذبہ بیدار کرتا ہے۔ رفقا کے ساتھ نرمی اور شفقت کا یہ مطلب نہیں کہ رفقا کو تفویض کردہ کام کا جائزہ نہ لیا جائے، ٹیم کی کارکردگی کا احتساب نہ ہو۔ اسی طرح قائد اور ذمے دار کے احترام کا مطلب یہ نہیں کہ وہ احتساب سے بالاتر ہوگا۔

جائزے اور احتساب کا ایسا نظام ہو، جس میں امیر و مامور سبھی ایک دوسرے کے سامنے جواب دہ ہوں۔ یہ عمل ٹیم اسپرٹ کو برقرار رکھتا ہے اور اجتماعیت کو مستحکم کرتا ہے۔ یہ عمل جتنا کمزور ہوگا، اجتماعیت اتنی ہی کمزور ہوگی۔ اگر قیادت کا احتساب نہ ہو تو قیادت کمزور ہوگی اور اگر ٹیم کا بھی احتساب نہ ہو تو ایسی ٹیم بھی کمزور ہوگی۔ قیادت کو چاہیے کہ اپنی ٹیم میں جائزے اور احتساب کی فضا کو نہ صرف بحال رکھے بلکہ پروان چڑھائے اور دوسروں کے احتساب سے پہلے خود اپنا احتساب کرے اور خود کو دوسروں کے سامنے احتساب کے لیے پیش کرے۔ احتساب کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ ہر فرد خواہ وہ ذمے دار ہو یا کارکن، اپنا احتساب خود کرے اور بے دردی کے ساتھ کرے اور

اپنے ساتھیوں کا احتساب نرمی اور درد کے احساس کے ساتھ کرے۔

● **قابلِ تقلید مثالیں:** افراد جماعت کی تربیت کے لیے مؤثر طریقہ یہ ہے کہ ان کے سامنے ایسی مثالیں موجود ہوں جو قابلِ تقلید ہوں، خواہ وہ ساتھیوں میں سے ہوں یا ذمے داروں میں سے۔ کیوں کہ انسان اپنے سامنے کے کردار سے جتنا متاثر ہوتا ہے اور اثر قبول کرتا ہے دیگر کسی ذریعے سے یہ نہیں ہوتا۔ خاص طور پر جو لوگ قیادت و رہنمائی کا فریضہ انجام دے رہے ہوں، وہ اپنے طرزِ عمل سے ایسی مثالیں پیش کریں جن کو دیکھ کر دوسروں کی حوصلہ افزائی ہو۔ جماعت کا کوئی ذمے دار ہو یا رفیق، بہرحال اس میں کمزوریاں ہوں گی، انھیں دیکھ کر مایوس بھی نہیں ہونا چاہیے۔ لیکن اس کے باوجود قیادت اور ذمے دار حضرات کی یہ ذمے داری ہوتی ہے کہ وہ اپنی زندگی اور طرزِ عمل سے قابلِ تقلید مثالیں پیش کریں۔

● **فکری رہنمائی اور تنظیم میں مطابقت:** اسلامی اجتماعیت کی بنیاد قرآن وسنت ہے۔ اس لیے ہم میں سے ہر شخص کو قرآن وسنت سے اپنا تعلق مضبوط کرنا چاہیے۔ خصوصاً ہمارے وہ ذمے دار جنھیں ہماری رہنمائی کرنی ہے، انھیں رہنمائی قرآن وسنت کی روشنی میں ہی کرنی چاہیے، تاکہ تحریک کا رشتہ قرآن وسنت سے ہر سطح پر استوار رہے اور ہر فیصلہ و ہدایت پر خواہ وہ چھوٹی ہو یا بڑی، تحریک پورے شرح صدر کے ساتھ گام زن رہے۔ جماعت و تحریک کے ماحول اور سمت اور تربیت کی کوششوں میں مطابقت کا ہونا ضروری ہے۔

درس قرآن و حدیث اور دوسرے ذرائع سے ہماری تربیت کے لیے جو غذائیں ملتی ہیں، اگر جماعت کے فیصلوں اور رہنمائی میں ان کی جھلک نہ ہو اور اس سے مطابقت نہ پائی جائے تو متضاد ذہن کے ساتھ تحریک کی پیش رفت معیارِ مطلوب کے مطابق نہیں ہوگی۔ اس سے داخلی استحکام بھی متاثر ہوگا۔ ضرورت ہے کہ ذمے دار اور قائدین اس بات پر خصوصی نظر رکھیں کہ جو باتیں وہ اپنے دروس، تقاریر اور تربیتی پروگراموں میں کہہ رہے ہیں، تنظیم کا ماحول اور رُخ بھی اسی سمت میں ہونا چاہیے۔ جو کچھ کہا جا رہا ہو یہ تو ممکن نہیں کہ تنظیم ہو بہو اس کا نمونہ ہو لیکن کم از کم اس بات کا اہتمام کیا جائے کہ مجموعی طور پر تنظیم کا ماحول اور رُخ انھی تعلیمات کی سمت میں ہو۔

☆ مقالہ نگار نائب امیر جماعت اسلامی، ہند ہیں

پہلا وہ گھر خدا کا!

مختصر تاریخ

مسعود جاوید

اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّةَ مُبٰرَکًا وَّھُدًی لِّلْعٰلَمِیْنَ (آل عمرٰن ۳:۹۶) بے شک سب سے پہلی عبادت گاہ جو انسانوں کے لیے تعمیر ہوئی وہ وہی ہے جو مکّہ میں واقع ہے۔ اس کو خیر و برکت دی گئی تھی اور تمام جہان والوں کے لیے مرکزِ ہدایت بنایا گیا تھا۔

خانہ کعبہ کا قدیم کتابوں میں تذکرہ

مشہور تاریخ دان ایڈورڈ ڈگبن نے اپنی کتاب The Decline And Fall of The Roman Empire (انحطاط و زوال رومۃ الکبریٰ) میں خانہ کعبہ کا ذکر عیسائیت کی ابتدا سے پہلے کیا ہے جس کی وجہ وہ یہ بتاتا ہے کہ یونانی تاریخ دان ڈیوڈورس نے خانہ کعبہ کا ذکر ثمود اور سبا کے واقعات کے ساتھ کیا ہے، لہٰذا اس کا وجود عیسائیت سے پہلے تھا۔ A.J Wensick نے لکھا ہے کہ دوسری صدی عیسوی میں کلاؤتس پٹولمی نے جو شہر مکروبہ کا ذکر کیا ہے وہ دراصل مکہ ہی ہے۔ یہ پٹولمی بھی یونانی تاریخ دان تھا اور اس کا انتقال ۱۶۸ء میں مصر کے شہر اسکندریہ میں ہوا (انسائی کلوپیڈیا آف اسلام)۔ G.E. Grunebaum نے بھی لکھا ہے کیونکہ مکراب کا لفظ عربی زبان میں معبد (temple) کے لیے استعمال ہوتا ہے اس لیے کلاؤتس پٹولمی نے مکروبہ کا جو لفظ مکہ کے لیے ہی استعمال کیا ہے، (Classical Islam)۔ Edward Glaser جو

جرمن تاریخ دان تھا، نے بھی کہا ہے کہ کعبہ کا لفظ مکراب سے نکلا ہے کیونکہ جنوبی عرب میں مکراب معبد کو کہتے ہیں۔ تورات میں اسے بیت ایل کہا گیا ہے، یعنی بیت اللہ۔

تعمیر کعبہ کے مراحل

تاریخ کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ کعبہ کی تعمیر بارہ مرتبہ ہوئی جس کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے: ۱- فرشتوں کی تعمیر ۲- حضرت آدمؑ کی تعمیر ۳- حضرت شیثؑ کی تعمیر ۴- حضرت ابراہیمؑ کی تعمیر ۵- عمالقہ کی تعمیر ۶- جرہم کی تعمیر ۷- قصی بن کلاب کی تعمیر ۸- قریش کی تعمیر ۹- حضرت عبداللہ بن زبیر کی تعمیر۔ ۱۰- حجاج بن یوسف کی تعمیر ۱۱- سلطان مراد رابع ابن سلطان احمد کی تعمیر ۱۲- خادمِ حرمین شریفین فہد بن عبدالعزیز کی تعمیر۔

● **فرشتوں کی تعمیر**: روایات میں آتا ہے کہ کعبہ دنیا کی تخلیق سے دو ہزار سال قبل جنت میں تعمیر کیا گیا اور یہ اب بھی موجود ہے جسے بیت المعمور کہا جاتا ہے۔ حضرت آدمؑ نے کعبہ کی تعمیر بیت المعمور کے عین نیچے فرمائی۔

● **حضرت آدمؑ کی تعمیر**: امام نووی نے سیدنا عبداللہ بن عباسؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ خانہ کعبہ پہلا گھر ہے جسے حضرت آدمؑ نے زمین میں تعمیر کیا)۔ اسی طرح امام بیہقیؒ نے دلائل النبوہ میں سیدنا عبداللہ بن عمرؓ سے مرفوعاً یہ روایت ذکر کی کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کے پاس جبرئیل امینؑ کو بھیج کر کعبۃ اللہ کی تعمیر اور پھر اس کے طواف کا حکم دیا۔ حضرت آدمؑ نے اس حکم کی تعمیل کر لی تو ان سے کہا گیا کہ اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ (آپ پہلے آدمی ہیں اور یہ بیت اللہ پہلا گھر ہے جو لوگوں کے لیے بنایا گیا ہے)۔ حضرت آدمؑ کا تعمیر کردہ بیت اللہ طوفانِ نوح تک اس زمین پر اسی جگہ موجود رہا۔ روایات سے پتا چلتا ہے کہ طوفانِ نوحؑ کے زمانے میں اسے اُوپر (آسمان پر) اُٹھا لیا گیا اور وہاں فرشتوں کے ذریعے وہ آباد ہو گیا۔ پھر حضرت ابراہیمؑ کے زمانے تک یہ جگہ خالی رہی اور اس مقام پر کوئی تعمیر نہیں ہوئی۔ البتہ یہ جگہ زمین سے اُونچی تھی اور ایک ٹیلے کی شکل میں تھی، اس لیے بارش اور سیلاب کا پانی اس تک نہ پہنچتا تھا۔

● **حضرت ابراہیمؑ کی تعمیر**: بخاری میں ایک طویل حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک دفعہ حضرت ابراہیمؑ اپنے بیوی بچے کی خبر لینے کے لیے شام سے مکہ مکرمہ تشریف لائے تو آپ

نے اپنے بیٹے حضرت اسماعیلؑ سے کہا کہ ''مجھے اللہ نے حکم دیا ہے کہ اس بلند جگہ پر ایک گھر تعمیر کروں''۔ اس طرح باپ بیٹے نے مل کر اللہ کا محترم گھر خانہ کعبہ تعمیر کیا۔ روایت ہے کہ طوفانِ نوحؑ کے موقع پر حجر اسود بھی آسمان پر اٹھالیا گیا تھا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ اس وقت اللہ نے جبل ابی قبیس کے پاس اس پتھر کو امانت رکھ دیا کہ جب میرا خلیل یہاں گھر تعمیر کرے گا تو اسے دے دینا (اخبار مکہ، ہدایہ السالک)۔ قرآن مجید میں خانہ کعبہ کی حضرت ابراہیمؑ اور ان کے فرزند حضرت اسماعیلؑ کے ہاتھوں تعمیر کا ذکر چار مقامات پر آیا ہے۔ سورۂ بقرہ، سورۂ ابراہیم اور سورۂ حج میں تفصیلات اور سورہ آل عمران میں ضمناً۔ اسی طرح بلدِ امین بلدِ حرام کا تذکرہ بھی کئی مقامات پر آیا ہے۔

● **عمالقہ اور جرہم کی تعمیر:** حضرت علیؓ کا قول جو امام نووی کی بیہقی اور ہدایہ السالک میں درج ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے تعمیر کردہ کعبۃ اللہ کی عمارت پر ایک زمانہ گزرا اور وہ منہدم ہوگئی تو پہلے عمالقہ پھر جرہم کے خاندان اور اس کے بعد قریش نے اس کی تعمیر کی۔ تاہم قریش کے علاوہ باقی تعمیرات کی تفصیل نہیں ملتی۔

● **قریش کی تعمیر:** زمانۂ جاہلیت میں بیت اللہ کی عمارت کمزور ہوگئی، چنانچہ قریش نے باہم مشاورت کے بعد یہ طے کیا کہ اس عمارت کو منہدم کر کے نئے سرے سے پختہ عمارت تعمیر کیا جائے۔ حُسنِ اتفاق سے ایک یونانی تاجر کی کشتی شعیبہ کے مقام پر تباہ ہوگئی تو اس کی لکڑی خانہ کعبہ کی تعمیر میں استعمال کی گئی۔ اس کاری گر کا نام جس نے یہ لکڑی کا کام کیا، بقوم بتایا جاتا ہے۔ جب کعبہ کی عمارت منہدم کرنے کا وقت آیا تو کوئی بھی کدال چلانے کو تیار نہیں تھا۔ آخر ولید بن مغیرہ نے کدال لگائی اور کہا کہ ''اے اللہ! ہم صرف خیر و بھلائی کا ارادہ رکھتے ہیں''۔ لوگ اس رات انتظار کرتے رہے کہ اگر ولید کو کوئی گزند پہنچی تو ہم اس کام سے باز آجائیں گے لیکن جب دیکھا کہ ولید کو کوئی گزند نہیں پہنچی تو پھر سب اس کام میں شامل ہوگئے۔ چادر میں حجر اسود رکھ کر ہر قبیلے کے سردار کو چادر کا ایک کونہ پکڑا دینا اور پھر رسولؐ اللہ کا اپنے دست مبارک سے حجر اسود کو اپنی جگہ پر رکھ دینے کا واقعہ اسی تعمیر کے موقع کا ہے۔

● **حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی تعمیر:** قریش کی یہ تعمیر عہد رسالتؐ میں اور اس کے بعد بھی ۶۰ھ کے کچھ بعد تک برقرار رہی۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اپنی خالہ اُم المومنین

حضرت عائشہؓ سے رسولؐ اللہ کے یہ ارشادات سنا کرتے تھے جو کہ رسولؐ اللہ کی خانہ کعبہ کے متعلق تین خواہشیں تھیں: ایک یہ کہ شمالی دیوار منہدم کرکے ابراہیمی بنیادوں پر اس کی تعمیر کی جائے۔ اس طرح جو حصّہ خانہ کعبہ کا قریش نے چھوڑ دیا تھا اسے خانہ کعبہ میں شامل کرلیا جائے۔ دوسرے یہ کہ پہلے کی طرح دروازہ (بابِ کعبہ) کو زمین سے متصل کردیا جائے تاکہ لوگ آسانی سے اندر داخل ہوسکیں۔ تیسرے یہ کہ مغربی سمت میں بھی ایک دروازہ نکالا جائے۔ چنانچہ جب آپ خلیفہ ہوئے اور مکہ مکرمہ میں انھیں اختیارات سلطنت اور قوت حاصل ہوئی تو رسولؐ اللہ کی ان خواہشات کو عملی جامہ پہنانے کا ارادہ کیا۔ اس کام کو شروع کرنے سے پہلے آپ نے تین دن تک استخارہ کیا۔ استخارے کے بعد جب انھیں اپنی راے پر شرح صدر ہوگیا تو انھوں نے اس کام کو کرگزرنے کا پختہ ارادہ کرلیا۔ روایات میں آتا ہے کہ اہلِ مکہ تین دن منٰی میں جاکر مقیم رہے، اس ڈر سے کہ کہیں کعبہ کو منہدم کرنے کے سبب اللہ کا عذاب نہ نازل ہوجائے۔ ایک روایت ہے کہ ایک شخص نے کام کی ابتدا کی لیکن ایک دوسری روایت میں ہے کہ خود حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے کدال لے کر یہ کام شروع کیا۔ لوگوں نے دیکھا کہ جب اللہ کی طرف سے کوئی آفت و مصیبت نازل نہیں ہوئی تو سب اس کام میں شریک ہوگئے۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ جب تعمیر کعبہ سے فارغ ہوئے تو اسے اندر سے، باہر سے، اُوپر سے، نیچے تک مشک و عنبر سے معطر کیا۔ عمدہ ریشم کا غلاف چڑھایا اور لوگوں کو حکم دیا کہ وہ شکرانہ کے طور پر تنعیم سے احرام باندھ کر عمرہ کریں۔ اُونٹ یا بکری کی قربانی کریں۔ اس دن لوگوں نے خوب غلام آزاد کیے اور بہت زیادہ جانوروں کی قربانیاں عمل میں آئیں۔ (بخاری)

● **حجاج بن یوسف کی تعمیر**: حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی یہ تبدیلی اور ترمیم زیادہ دنوں تک نہ رہ سکی۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی شہادت اور مکہ مکرمہ پر حجاج بن یوسف کے قبضے کے بعد اس نے اس کی خبر عبدالملک بن مروان کو بھیجی۔ اس نے عبداللہ بن زبیرؓ کو بُرا بھلا کہا اور حجاج کو لکھ بھیجا کہ ابن زبیرؓ نے بلندی میں جو اضافہ کیا ہے اسے تو برقرار رکھا جائے لیکن حطیم کی طرف کے اضافے کو ختم کردیا جائے، اور مغربی سمت کے دروازے کو بھی بند کردیا جائے، اور سابقہ حالت کی طرف اس عمارت کو لوٹا دیا جائے۔ روایت ہے کہ عبدالملک بن مروان ابتدا میں عمارت کعبہ کی تجدید پر ابن زبیرؓ کو بُرا بھلا کہتا تھا لیکن جب اس کے نزدیک ایک قابلِ اعتماد شخص نے اُم المومنین

حضرت عائشہؓ سے خود اس حدیث کے سننے کا اقرار کیا، تو اس نے اپنے کیے پر افسوس کا اظہار کیا تھا۔ جب ولید بن عبدالملک کی خلافت کا دور آیا تو اس نے مکہ مکرمہ کے گورنر خالد قسری کو ۳۶ ہزار دینار بھیجے۔ اس نے کعبہ کے دروازے، میزاب (پرنالے) اور اندرونی ستونوں وغیرہ پر سونے کے پترے چڑھا دیے۔ اسلامی تاریخ میں ولید بن عبدالملک وہ پہلے خلیفہ ہیں جنھوں نے بیت اللہ میں سونے کا کام کرایا۔ اس کے بعد خلیفہ ہارون رشید نے اپنے دورِ خلافت میں یہ ارادہ کیا کہ خانہ کعبہ کو دوبارہ رسولؐ اللہ کی خواہش کے مطابق تعمیر کر دے لیکن امام مالکؒ نے اسے ایسا کرنے سے منع فرمایا اور کہا کہ اللہ کے اس مقدس گھر کو بادشاہوں کے ہاتھوں کھلونا نہ بنایئے کہ ہر بادشاہ اسے توڑتا جائے اور بناتا جائے۔ چنانچہ ہارون رشید اپنے ارادے سے باز رہا۔

● **سلطان مراد کی تعمیر:** مصر کے بادشاہ مرقوق کے دور میں ۸۰۶ھ میں مسجد میں آگ لگ گئی۔ سلطان مرقوق نے عمارت دوبارہ تعمیر کر کے اس پر پہلے کی طرح ساگوان کی لکڑی کی چھت ڈال دی۔ پھر کئی بار اس کی مرمت بھی ہوتی رہی لیکن آہستہ آہستہ خستہ ہوگئی۔ سلطان سلیم نے نئی عمارت بنانے کا حکم دیا اور کہا کہ چھت لکڑی کی نہ ڈالی جائے بلکہ وہ گنبدوں کی شکل میں تعمیر کی جائے۔ یہ کام ۹۷۹ھ میں شروع ہوا اور پھر سلطان مراد کے ہاتھوں ۹۸۴ھ میں مکمل ہوا۔

● **خادم حرمین شریفین فہد بن عبدالعزیز کی تعمیر:** خانہ کعبہ کے متولی طہ الشیبی نے اپنے بیٹے عبدالملک الشیبی کے ساتھ مدینہ منورہ میں خادم حرمین فہد بن عبدالعزیز سے ملاقات کی اور بتایا کہ کعبہ کی عمارت کمزور ہوتی جارہی ہے۔ اس کی مرمت کی ضرورت ہے۔ ابتدا میں یہ خیال تھا کہ محض مرمت کر دی جائے لیکن جب محسوس کیا گیا کہ لکڑی بالکل خراب ہوگئی تو مکمل عمارت کی تعمیر کا فیصلہ کیا گیا۔ بن لادن کمپنی نے ہیلی کاپٹروں کے ذریعے برما کے جنگلات سے بہترین لکڑی burma teak جس میں کسی قسم کی گٹھان نہیں تھی، حاصل کی۔ اس لکڑی کی خاصیت یہ ہے کہ اس کو دیمک نہیں لگتی۔ اس کے علاوہ ایسے رنگ کا انتخاب کیا گیا جس میں کسی قسم کی بُو شامل نہیں تھی کیونکہ خانہ کعبہ عموماً سال میں دو دفعہ کھلتا ہے۔ غالب بن لادن کمپنی کی طرف سے خانہ کعبہ کی تعمیر کے کام کے نگران مقرر ہوئے جنھوں نے بہت احتیاط سے کام کا آغاز کیا اور جہاں بھی مشکل پیش آئی استخارے سے مدد لی۔ شرک یا بدعات سے بچنے کے لیے عملے کے کسی بھی رکن کو

عمارت کا کوئی پتھر یا مٹی لے جانے کی اجازت نہ دی۔ اس سے قبل خانہ کعبہ کے مطاف کی تعمیر و مرمت کا کام بھی بن لادن کمپنی کو دیا گیا تھا جنھوں نے یونان کے مشہور تھوسس آئیرلینڈ سے سفید کرسٹالینو منگوا کر مطاف میں لگایا جو کہ ہر قسم کی گرمی میں ٹھنڈا رہتا ہے۔ خانہ کعبہ کا دروازہ ۳۰۰ کلوگرام سونے سے ۱۹۷۹ء میں احمد بن ابراہیم نے شاہ خالد بن عبدالعزیز کی خواہش پر لگایا تھا۔ اس لیے اسے جوں کا توں رکھا گیا۔ خانہ کعبہ کے اندر بھی ایک دروازہ ہے جسے بابِ توبہ کہتے ہیں۔ اس دروازے سے چھت پر جایا جاتا ہے۔ چھت پر جانے والی سیڑھی ترکی سے بنوائی گئی ہے جس کے قدمچے کرسٹل کے بنے ہوئے ہیں، البتہ باقی فریم عمدہ سٹیل سے بنایا گیا ہے۔ فرش پر سفید ماربل استعمال کیا گیا ہے اور فرش کے درمیان ہرے ماربل سے نقش بنائے گئے ہیں۔ دیوار کے نچلے حصے میں ہرا ماربل استعمال کیا گیا ہے، جب کہ اُوپر کے حصے میں ہلکے سفید رنگ کا ماربل استعمال کیا گیا ہے۔ آدھی دیوار ماربل کی ہے اور اُوپر والے حصے میں ہرا کڑھا ہوا کپڑا لگایا گیا ہے جو کہ خادم حرمین شریفین خالد بن عبدالعزیز کا عطا کردہ ہے۔ ماضی کی طرح دو چھتیں رکھی گئی ہیں۔ پہلی چھت لکڑی کی ہے اور دوسری چھت بھی لکڑی کی ہے لیکن وہ واٹر پروف ہے اور اس پر ماربل لگا دیا گیا ہے۔

خانہ کعبہ کی لمبائی ۱۸ فٹ، چوڑائی ۱۴ فٹ اور اُونچائی ۳۵ فٹ ہے۔ دروازہ عام سطح سے ۶،۷ فٹ بلند ہے۔ کعبہ کی چھت پر پرنالہ نصب ہے جسے میزاب رحمت کہتے ہیں۔ کعبہ کے اندر تین ستون ہیں۔ خانہ کعبہ کی چھت کے ساتھ ایک رسی کے ذریعے تحفے میں آئے ہوئے قدیم برتن جن میں سے کچھ پانچ سو سے چھے سو سال پرانے ہیں، لٹکا دیے گئے ہیں اور دروازے کے سامنے درازوں والی ایک الماری رکھی ہوئی ہے۔ باب توبہ پر آیاتِ توبہ لکھی ہوئی ہیں۔ دیواروں پر بہت خوب صورت کتبے لگے ہوئے ہیں۔ خانہ کعبہ کی اس تعمیر کا کام پانچ ماہ کے عرصے میں ختم ہوا اور ایسی حکمت عملی اختیار کی گئی کہ ان پانچ ماہ میں طواف نہیں رُکا۔ کام کرنے والوں میں دو پاکستانی انجینیر خالد وحید اور جاوید گل کا کام نمایاں رہا۔ خانہ کعبہ سال میں صفائی کے لیے دو دفعہ کھلتا ہے۔ پہلی دفعہ ۱۵ محرم کو اور دوسری دفعہ پہلی شوال کو۔ غلافِ کعبہ عرفات والے دن بدلا جاتا ہے۔ خانہ کعبہ اور مقامِ ابراہیم کی چابی شروع سے لے کر آج تک الشیبی خاندان کے پاس ہے، کیوں کہ

فتحِ مکہ کے وقت حضور پاکؐ نے خود یہ چابی ان کو دی تھی اور فرمایا تھا: ''جو ان سے یہ چابی چھینے گا اس سے بڑا ظالم کوئی نہ ہوگا''۔

کعبہ میں بت پرستی

مکہ میں بت پرستی کی ابتدا عمرو بن لحی نے کی۔ یہ بنوخزاعہ کا سردار تھا اور اس کا زمانہ رسولؐ اللہ کی بعثت سے ۴۰۰ سال پہلے کا بتایا جاتا ہے۔ روایات میں آتا ہے کہ عمرو بن لحی کے تابع ایک جن تھا جس کے ذریعے اس نے یغوث، یعوق اور نسر نامی بتوں کو جدہ کے قریب دریافت کیا۔ سورۂ نوح (۷۱:۲۲) میں بھی ان بتوں کا ذکر ہے۔ لات بھی ایک بت تھا جس کے معنی ستو گھولنے والے کے ہیں۔ یہ ایک شخص تھا جو حاجیوں کو ستو پلایا کرتا تھا۔ بعد میں عمرو بن لحی نے بت بنا کر اس کی پوجا شروع کردی۔ اس کے علاوہ بھی وہ شام سے بت لے کر آیا تھا۔ ہبل قریش کا سب سے بڑا دیوتا تھا۔ یہ بت قریش کو انسانی مورت میں ملا تھا جو سرخ عقیق سے تراشا گیا تھا۔ اس کا دایاں ہاتھ ٹوٹا ہوا تھا۔ قریش نے وہ سونے کا بنوا کر لگا دیا۔ ہبل خاص خانہ کعبہ میں نصب تھا۔ فال کے پانسے اسی کے آگے ڈالے جاتے تھے۔ قریش جنگوں میں اعل ہبل (ہبل کی جے) کا نعرہ لگاتے تھے۔ فتحِ مکہ کے موقع پر حضرت علیؓ نے ہبل اور منات کو اور حضرت خالد بن ولیدؓ نے العزیٰ کو توڑا تھا۔

کعبہ کی پاسبانی

مؤرخین کہتے ہیں کہ جب بنوجرہم نے کعبہ کی توہین کی تو اللہ تعالیٰ نے انھیں منتشر کر دیا۔ پھر بنوخزاعہ اس کے پاسبان بنے۔ ان کے بعد قصی بن کلاب اس کا پاسبان بنا۔ کعبہ کی پاسبانی کے ساتھ ساتھ اس نے مکہ کی حکومت بھی سنبھال لی۔ پھر اس نے اپنے بیٹے عبدالدار کو کعبہ کی پاسبانی، دارالندوہ اور جھنڈا سپرد کیا۔ عبدالدار نے اپنے بیٹے عثمان کو کعبہ کی پاسبانی سونپ دی۔ یوں نسل در نسل یہ عہدہ اسی کی اولاد میں منتقل ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ عثمان بن طلحہ پاسبان بنے۔ فتحِ مکہ کے وقت آپؐ نے عثمان بن طلحہؓ سے چابی طلب کی۔ وہ چابی دیتے ہوئے جھجک رہے تھے کیونکہ حضرت عباسؓ بھی اس چابی کو طلب کر رہے تھے۔ اس پر نبی کریمؐ نے عثمانؓ سے فرمایا: ''اگر تو اللہ تعالیٰ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتا ہے تو چابی مجھے دے دے''۔ وہ کہنے لگے: اے اللہ کے رسولؐ! یہ حاضر ہے لیکن یہ اللہ کی امانت ہے۔ آپؐ نے چابی پکڑ لی، بیت اللہ کا دروازہ کھولا تو حضرت جبرئیلؑ

یہ وحی لے کر اُترے: اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓی اَھْلِھَا (النساء ۴:۵۸) ''اللہ تمھیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے مالکوں کے سپرد کرو''۔ آپؐ نے اس آیت کی رو سے حضرت عثمانؓ کو چابی دے دی اور یہ بھی کہہ دیا کہ قیامت تک اب یہ چابی تمھارے پاس رہے گی۔ اگر کوئی اسے لے گا تو ظلم کرے گا۔ حضرت عثمانؓ نے اپنی وفات کے وقت اپنے چچا کے بیٹے شیبہ بن عثمان بن ابی طلحہؓ کو دے دی۔ اس وقت سے پاسبانی کا منصب شیبہ کی اولاد میں جاری ہے۔ آج کل چابی عبدالقادر بن طہ الشیبی کے پاس ہے۔ خانہ کعبہ ہمیشہ یہی لوگ کھولتے ہیں۔ غزوۂ بدر کے سلسلے میں ذکر آتا ہے کہ جب رسولؐ اللہ نے سنا کہ قریش کا جھنڈا عبدالدار خاندان کے ایک مشرک کے ہاتھ میں ہے، تو فرمایا کہ حق رسانی اسلام کا فریضہ ہے اور یہ کہہ کر اپنا جھنڈا حضرت مصعب بن عمیر العبدیؓ (جو اسی خاندان کے ایک مسلمان تھے) کے سپرد فرمایا۔

غلافِ کعبہ

سب سے پہلے جس نے کعبہ کو مکمل غلاف چڑھایا وہ تبع اسعد الحمیری تھے۔ آپ کا زمانہ رسولؐ اللہ کی بعثت سے ۷۰۰ سال پہلے بتایا جاتا ہے۔ ان کو خواب میں نظر آیا کہ وہ کعبہ کو غلاف چڑھا رہے ہیں، لہٰذا انھوں نے چمڑے کا غلاف چڑھایا۔ پھر انھیں خواب میں دکھائی دیا کہ اور غلاف چڑھائیں تو انھوں نے یمن کے بنے ہوئے سرخ دھاری دار کپڑے کا غلاف چڑھایا۔ امام محمد بن اسحاق کی اس روایت کی تصدیق ایڈورڈ گبن نے بھی اپنی تاریخ میں کی ہے۔ تبع کے بعد دورِ جاہلیت میں بہت سے لوگوں نے اپنے اپنے وقت میں غلاف چڑھائے۔ کعبہ کو مختلف قسم کے کپڑوں کے غلاف چڑھائے جاتے رہے، مثلاً چمڑے کا غلاف، سرخ دھاری دار کپڑے کا غلاف۔ یمن کے کامدار کپڑے کا غلاف یہاں تک کہ ابوربیعہ بن مغیرہ مخزومی نے شہر جند سے دھاری دار کپڑے کا غلاف تیار کروایا اور خانہ کعبہ پر چڑھایا۔ بعدازاں دو غلاف چڑھائے جانے لگے۔ ایک ریشمی اور دوسرا قباطی۔ ناصر عباسی نے سب سے پہلے سیاہ رنگ کا غلاف خانہ کعبہ پر چڑھایا۔ اس وقت سے آج تک سیاہ رنگ کا غلاف ہی چڑھایا جارہا ہے۔

۱۵۷ء میں مصر کے بادشاہ اسماعیل بن ناصر بن قلوون نے کعبہ کے غلاف کے لیے ایک مخصوص وقف قائم کر دیا لیکن خدیوی محمد علی نے تیرھویں صدی میں یہ وقف ختم کر دیا اور

غلاف سرکاری وقف پر تیار ہونے لگا۔ ۸۱۰ھ میں کعبہ کے دروازے کے لیے ایک الگ منقش پردہ تیار کیا گیا جسے غلافِ کعبہ کا برقع کہا جاتا تھا اور اب تک یہ پردہ بھی غلاف کے ساتھ ہی تیار کیا جاتا ہے۔ شاہ سعود بن عبدالعزیزؒ نے غلاف کعبہ تیار کرنے کے لیے مکہ مکرمہ میں ایک الگ کارخانہ لگانے کا حکم دیا۔ ۱۳۸۲ھ میں شاہ فیصل شہیدؒ نے اس کارخانے کی تعمیرِ نو کا حکم دیا تاکہ غلاف انتہائی مضبوط اور عمدہ تیار ہو، نیز وہ کعبہ مشرفہ کے تقدس کے شایانِ شان ہو۔ ۱۳۹۷ھ میں مکہ مکرمہ کے مقام اُم الجود میں اس کارخانے کی نئی عمارت کا افتتاح ہوا۔ اس میں غلاف کی تیاری کے لیے مشینی آلات کے ساتھ ساتھ دستی کشیدہ کاری کا انداز بھی قائم رکھا گیا کیونکہ فنی لحاظ سے دستی کشیدہ کاری کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ یہ سلسلہ آج تک جاری و ساری ہے!

یا حیُّ — بسم اللہ الرحمٰن الرحیم — یا قیُّوم

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہ

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَ عَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌO اَللّٰھُمَّ بَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا بَارَکْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَ عَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌO

سیرت نبوی ﷺ پر عمل کی نیت سے ڈاکٹر عبدالحی عارفی ؒ کی تالیف ''اسوۂ رسول اکرم ﷺ'' کا مطالعہ بہت مفید ہے۔

حضور ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے دور کی یاد تازہ کرنے کیلئے بڑی مفید کتاب ''ہمارا اسلام قبول کرنا''

رابطہ کیلئے ادارہ منشورات منصورہ لاہور فون: 042-35434909

نیک بنو نیکی پھیلاؤ

خصوصی گزارش: مکۃ المکرمہ اور مدینۃ المنورہ جانے والے حضرات سے حرم کعبہ اور روضۂ رسول ﷺ پر حاضری کے وقت خصوصی دعا اور سلام پیش کرنے کی درخواست ہے

بہترین کتب

ڈاکٹر محمود احمد غازی

محاضرات قرآنی	400/-
محاضرات حدیث	500/-
محاضرات سیرت ﷺ	550/-
محاضرات فقہ	500/-
محاضرات شریعت	500/-
محاضرات معیشت وتجارت	500/-

سید قاسم محمود

شاہکار اسلامی انسائیکلوپیڈیا	4,000/-
انسائیکلوپیڈیا پاکستانیکا	3,000/-
سائنس کیا ہے؟	1500/-
مسلم سائنس	350/-
ہماری کائنات	350/-
اسلامی سائنس	350/-
پیام رومی	200/-

ڈاکٹر غلام جیلانی برق کی شاہکار کتب

دو قرآن	250/-
من کی دنیا	240/-
اللہ کی عادت	200/-
بھائی بھائی	200/-
دانش رومی وسعدی	180/-
عظیم کائنات کا عظیم خدا	180/-
امام ابن تیمیہ	200/-
میری آخری کتاب	200/-

ڈاکٹر غلام جیلانی برق کی باقی تمام کتب زیر طبع ہیں

رائے خدا بخش کلیار ایڈووکیٹ

فلسفہ سائنس اور قرآن	225/-
آب زم زم (یحییٰ ہمزہ کوشک)	150/-
اسلام میں عبادت کا حقیقی مفہوم	220/-

فلسطین: جدوجہدِ آزادی نئے موڑ پر

عرب بیداری کے پس منظر میں

عبدالغفار عزیز

۲ فروری کا دن حسنی مبارک کے خلاف تحریک کا ایک اہم دن تھا۔ قاہرہ کے میدان التحریر میں لاکھوں افراد جمع تھے۔ اکثر لوگوں نے میدان التحریر کو آنے والے مختلف راستوں پر باقاعدہ مورچے لگائے ہوئے تھے۔ اس سے پہلے حکومت کی طرف سے بھیجے گئے مسلح غنڈے مظاہرین پر حملہ آور ہوکر بڑی تعداد میں لوگوں کو شہید کر چکے تھے۔ ایک 'مورچے' پر مصر کے معروف عالمِ دین اور دانش ور صفوت حجازی بھی تھے۔ وہ بتا رہے تھے کہ ہم نے ساری رات پہرہ دے کر گزاری۔ لوگ باری باری نیند اور تہجد و عبادت میں مصروف تھے۔ مجھے نہ جانے کیوں بار بار لگ رہا تھا کہ آج مجھے بھی شہید ہو جانا ہے۔ نمازِ فجر کا وقت ہوا تو غنڈوں کے حملے کے خوف سے ہم نے نماز بھی باری باری ادا کی۔ میرے ساتھ ہی ایک نوجوان عبدالکریم بھی تھا۔ اس سے وہیں تعارف ہوا۔ وہ جامعہ الازہر سے فارغ التحصیل تھا۔ ۲۵ پارے حفظ کیے ہوئے تھے اور زیادہ وقت تلاوت میں مصروف تھا۔ اس کی تلاوت میں ایک عجیب تاثیر تھی۔ میں نے اسے ہی امامت کے لیے کہہ دیا۔ نماز پڑھ کر وہ مجھے مخاطب ہوتے ہوئے بولا: میں اگر اس میدان میں مارا جاؤں تو کیا شہادت کا درجہ ملے گا؟ میں نے کہا: ضرور ملے گا۔ کہنے لگا: دلیل کیا ہے؟ میں نے کہا: رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: سید الشھداء حمزہ ورجل قام اِلی امام جائر فامرہ ونھاہ فقتلہ ''(حضرت) حمزہ سیدالشہدا ہیں اور ہر وہ شخص بھی کہ جو ظالم حکمران کے سامنے ڈٹ گیا اسے (نیکی کا) حکم دیا اور (برائی سے) منع کیا اور اس نے جواباً اسے قتل کر دیا''۔

کچھ دیر مزید بات ہوئی جس میں، مَیں نے اپنا یہ احساس بھی بتایا کہ مجھے لگتا ہے کہ مجھے بھی شہادت کی سعادت ملے گی۔ عبدالکریم فوراً بولا: اگر مجھ سے پہلے چلے گئے تو سیدالشہدا حضرت حمزہؓ کو میرا سلام کہیے گا۔ میں نے کہا: اور اگر آپ چلے گئے تو آپ میرا سلام پہنچا دیجیے گا۔ عبدالکریم یہ سنتے ہی اُٹھ کر چل دیا۔ میں نے پوچھا: کدھر چل دیے؟ ہنستے ہوئے کہنے لگا: سیدالشہدا کو آپ کا سلام پہنچانے...... ابھی عبدالکریم نے ایک قدم بھی نہیں اُٹھایا تھا کہ وہیں ڈھیر ہوگیا۔ ہم نے دیکھا تو دُور گھات لگائے بیٹھے سرکاری غنڈے کی دُور بین لگی بندوق کی ایک گولی عبدالکریم کے سر میں چھید کرتی ہوئی نکل گئی تھی اور ہر طرف کستوری کی مہک پھیل رہی تھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ عبدالکریم کا تعلق الاخوان المسلمون سے تھا۔

تقریباً نصف صدی عذاب واذیت میں تو گزر گئی، لیکن الاخوان المسلمون نے اس عرصے میں لاکھوں افراد پر مشتمل ایک ایسی نسل تیار کر دی ہے کہ جو بلند مقاصد کی خاطر ہر طرح کی قربانی دینے کے لیے ہر لمحے تیار رہتی ہے۔ اللہ ہمارا مقصود ہے، قرآن ہمارا دستور ہے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے رہنما ہیں، کے بعد الجهاد سبيلنا ، ''جہاد ہمارا راستہ ہے'' اور الشهادة في سبيل الله أسمى أمانينا، ''اللہ کی راہ میں شہادت ہماری سب سے بلند پایہ آرزو ہے'' کا شعار اس ربانی نسل کا پورا تعارف کروا دیتا ہے۔ تیونس اور مصر کے فرعونوں سے نجات کے لیے اس نوجوان نسل کی قربانیوں نے عالمِ عرب کے ہر نوجوان کو ایک نئی روح سے سرشار کر دیا ہے۔ اس کا ایک مظہر تو یمن، شام اور لیبیا میں دکھائی دے رہا ہے، لیکن اس کا ایک تازہ اور حیران کن مظہر ۱۵ مئی کو دکھائی دیا۔ لیکن آئیے پہلے ۱۵ مئی کا تھوڑا سا پس منظر ذہن میں تازہ کر لیجیے۔

آج سے ۶۳ سال پہلے، ۱۵ مئی ۱۹۴۸ء کو سرزمینِ اقصیٰ میں ایک قیامت برپا ہوئی تھی۔ فلسطینی شعبہ شماریات کے مطابق اس وقت فلسطینی عوام کی کُل تعداد ۱۴ لاکھ تھی۔ پورے فلسطین میں ان کے ۱۳۰۰ شہر، قصبے اور بستیاں آباد تھیں۔ یہودیوں نے برطانوی سرپرستی اور مسلمان حکمرانوں کی خیانت کے باعث فلسطینی عوام کا قتلِ عام شروع کر دیا۔ ۷۷۴ شہروں اور بستیوں پر قبضہ کرلیا، ان میں سے ۵۳۱ شہر اور بستیاں مکمل طور پر تباہ کر دیے۔ ۱۵ ہزار فلسطینی قتل کر دیے اور ۸ لاکھ فلسطینیوں کو ان کے گھروں سے بے گھر کر کے مہاجر کیمپوں اور پڑوسی ملکوں میں دھکیل دیا۔ تب سے

۱۵مئی کو یومِ نکبت کہا جاتا ہے۔ گذشتہ ۶۳ برس سے ہر سال اس یومِ نکبت کی یاد منائی جاتی ہے۔

مصر اور تیونس میں عوامی جدوجہد کی کامیابی کے بعد یومِ نکبت قریب آنے لگا تو مصر سمیت فلسطین کے تمام پڑوسی ملکوں کے نوجوانوں نے اس دن کو ایک منفرد انداز میں منانے کا اعلان کیا۔ انھوں نے اعلان کیا کہ اس برس ہم یہ دن سرزمین انبیا فلسطین کی سرحدوں پر جاکر منائیں گے۔ اس اعلان نے مصر، فلسطین، اُردن، لبنان اور شام سمیت ہر جگہ نوجوانوں کو ایک نئے جذبے سے سرشار کردیا۔ موبائل فون اور انٹرنیٹ کے ذریعے ایک دوسرے کو پیغامات دیے جانے لگے اور ۱۵مئی ۲۰۱۱ء کا دن واقعی ایک تاریخی دن بن گیا۔ اس روز بوڑھے، بچے، مرد و زن سب بڑی تعداد میں اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قبلۂ اول اور اپنے آباواجداد کی سرزمین کی طرف دیوانہ وار چل نکلے۔ ۱۵مئی کو اتوار کا دن تھا لیکن مصر اور اُردن میں لوگ جمعے کے روز سے ہی جمع ہونے لگے۔ پھر اتوار کے روز لبنان کے علاقے مارون الراس اور شام کے مقبوضہ علاقے جولان کی سرحدی بستیوں القنیطرۃ اور مجدل الشمس میں ہزاروں کی تعداد میں لوگ جمع ہونے لگے۔ ہر شخص جذبات سے اس طرح سرشار تھا کہ گویا یہ فلسطین کی آزادی کا دن ہے۔ بہت سے لوگوں نے اپنے ہاتھوں میں لکڑی کی بنی ہوئی بڑی بڑی چابیاں اُٹھائی ہوئی تھیں۔ چابی کا نشان بے دخل کیے جانے والے فلسطینیوں کے حقِ واپسی کی علامت بن چکا ہے۔ مظاہرین سرحدوں پر ہی جمع ہوکر مظاہرے کرتے تو صورت حال مختلف ہوتی۔ صبح تقریباً ۱۰ بجے سے جمع ہونے والے مظاہرین کی تعداد جب ہزاروں میں ہوگئی تو انھوں نے سرحد پر بچھی بارودی سرنگوں اور گشت کرتی اسرائیلی فوجی گاڑیوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے، اپنے اور فلسطین کے مابین حائل خاردار تاروں اور آہنی جنگلوں کو روند ڈالا۔ بڑی تعداد میں لوگ فلسطینی دھرتی کی آغوش میں آنے اور وہاں سجدہ ریز ہونے کے لیے بے تاب تھے۔ آگے بڑھتے ہوئے انھوں نے یہودیوں پر پتھراؤ بھی شروع کردیا۔

آئیے اس صورت حال کی مزید جھلک بڑے اسرائیلی روزنامے یدیعوت کے الفاظ میں ملاحظہ کیجیے: ''اسرائیلی سرزمین میں گھس جانے والے فلسطینی پتھراؤ کرنے لگے۔ کچھ لوگوں نے وہاں زیرتعمیر ایک گھر میں پناہ لے لی، اور وہاں سے پتھراؤ شروع کردیا۔ پتھروں کی بارش یہودیوں یا دُرزی قبیلے کے افراد میں کوئی تمیز نہیں کر رہی تھی، نہ ہی انھوں نے یہودی فوجیوں اور شہریوں میں

کوئی تمیز کی۔ مجھے ایک اسرائیلی شہری نے ۱۶ مئی کو بتایا کہ ''میں اپنی پوری زندگی میں اتنا خوف زدہ نہیں ہوا جتنا کل ہوا تھا''۔ ہم نے فلسطینیوں سے کہا کہ پتھراؤ بند کردو، وگرنہ فوج فائر کھول دے گی۔ انھوں نے جواب دیا: ''پرواہ نہیں، ہم یہاں مرنے کے لیے آئے ہیں''۔ جو کچھ جولان میں ہوا، لبنانی سرحدوں پر بھی وہی ہوا۔ اسرائیلی فوج اور حزب اللہ کے ٹی وی چینل 'المنار' کی بنائی ہوئی تصاویر میں آپ واضح طور پر دیکھ سکتے ہیں کہ فلسطینی جوق در جوق مارون الراس کے ٹیلوں سے اُتر کر آگے بڑھ رہے ہیں۔ ان پر اسرائیلی فوج نے بھی فائرنگ کی اور خود لبنانی فوج نے بھی۔ کچھ افراد زخمیوں اور مرنے والوں کی لاشیں اُٹھا کر پیچھے جاتے لیکن ان سے زیادہ اور آگے آجاتے۔ یہ لوگ سرحد پر لگے آہنی جنگلے کی طرف یوں بڑھ رہے تھے، جیسے کسی نشے سے سرشار ہوں۔ ہم نے یہ مناظر گذشتہ مہینوں میں (قاہرہ کے) میدان التحریر، (لیبیا کے شہر) بن غازی اور (شام کے شہر) درعا اور بانیاس میں تو دیکھے تھے لیکن اسرائیلی سرحدوں پر یہ مناظر اس ہفتے پہلی بار دیکھنے میں آئے۔ یہ لوگ حماس کے خودکش حملہ آور نہیں تھے بلکہ فیس بک کے حملہ آور تھے...... یہ لوگ دوبارہ پھر آئیں گے اور یہ اس ہفتے کے واقعات سے سیکھا جاسکنے والا پہلا سبق ہے (مظاہرین کے مطابق) آیندہ ستمبر میں یہ مناظر دوبارہ دہرائے جاسکتے ہیں''۔ (یدیعوت احرونوت، ۲۰ مئی ۲۰۱۱ء)

لبنان اور شام کی سرحدوں پر اسرائیلی فائرنگ سے درجنوں فلسطینی شہید ہوگئے، سیکڑوں زخمی ہوگئے لیکن عرب بالخصوص فلسطینی عوام اس تازہ وجدان و روح سے سرشار ہوگئے ہیں کہ بالآخر ایک روز ہم ان خاردار اسرائیلی جنگلوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے روند ڈالیں گے۔ فیس بک کے ذریعے تحریک چلانے والے نوجوان اعلان کررہے ہیں کہ ۶۳ سال بعد یہ پہلا موقع تھا کہ تین اطراف سے چار عرب ممالک کے عوام فلسطینی سرزمین کی جانب بڑھے۔ اس سال ان کی تعداد ہزاروں میں تھی، لیکن شہادتوں اور قربانیوں کی پرواہ کیے بغیر اگر کئی ملین کی تعداد میں لوگ نکل آئے، خود فلسطین کے اندر سے بھی اتنی ہی تعداد میں فلسطینی باہر آگئے تو عرب عوام کے سمندر میں گھرا صہیونی جزیرہ اپنا وجود باقی نہ رکھ سکے گا۔ خود اسرائیلی تجزیہ نگار اور عسکری ماہرین ان واقعات کا مسلسل جائزہ لے رہے ہیں۔ یہ بحث بھی عروج پر ہے کہ ہم ان واقعات کا اندازہ پہلے سے کیوں نہ لگا سکے؟ کیا یہ انٹیلی جنس کی ناکامی ہے یا فوج صورت حال پر قابو نہیں پاسکی؟

اس بارے میں بھی ایک اہم ترین تبصرہ خود یدیعوت احرونوت کے الفاظ ہی میں ملاحظہ فرمائیے: ''انٹیلی جنس کی ناکامی کے اسباب کا جائزہ لینا بھی اہم ہے لیکن اتوار کے روز ہونے والے واقعات کچھ اور اسباب کی بنا پر بھی بہت اہم ہیں۔ پہلا یہ کہ اسرائیل فلسطین تنازع اب دوبارہ پورے خطے کا تنازع بن چکا ہے۔ اب اسرائیل کی کوئی بھی سرحد محفوظ نہیں رہ گئی۔ نہ شام، نہ مصر اور نہ لبنان، کسی طرف سے بھی ہماری سرحد محفوظ نہیں ہے۔ دوسرا یہ کہ اسرائیلی فوج غیرمسلح شہریوں کی تحریک نافرمانی کا مقابلہ نہیں کرسکتی، بالخصوص اس وقت کہ جب اس میں خواتین اور بچے بھی شریک ہوں۔ تیسرا یہ کہ اب ہم عرب ممالک کی حکومتوں پر یہ بھروسا نہیں کرسکتے کہ وہ اسرائیلی سرحدوں کی حفاظت کرسکیں گے۔ چوتھا (اہم ترین) سبب یہ ہے کہ خوف کے حصار سے نجات، ایک متعدی مرض ہے، جو عوام بشارالاسد کے ٹینکوں کے خوف سے آزاد ہوگئے ہیں، وہ اسرائیلی فوج کی بارودی سرنگوں سے بھی نہیں ڈریں گے'' (یدیعوت، ۲۰ مئی ۲۰۱۱ء)۔ اسرائیلی تجزیہ نگار کے یہ دونوں نکات پوری بحث کا خلاصہ بتا رہے ہیں کہ عرب حکمران اسرائیل کا مزید دفاع کرنے کے قابل نہیں رہے اور اگر عوام خوف کی دیوار ڈھا دیں تو پھر کوئی قوت ان کا راستہ نہیں روک سکتی۔

تھا تو یہ ایک روز کا مظاہرہ، لیکن چند ہزار افراد کے سرحدوں پر اُمڈ آنے سے چہار جانب خطرے کی گھنٹیاں بج اُٹھی ہیں۔ اسرائیل کے علاوہ خود امریکا میں اس پر بحث ہورہی ہے۔ کانگریس میں ری پبلکن پارٹی کے اہم یہودی رہنما ایرک کینٹر (Eric Cantor) نے گذشتہ دنوں معروف یہودی ادارے 'ایپاک' AIPAC سے خطاب کرتے ہوئے خبردار کیا ہے کہ ''ہمارے خواب خطرات سے دوچار ہیں''۔ ''اسرائیل کی بقا کی ضمانت دینے کے لیے اب ہمیں ہرممکن کوشش کرنا ہوگی''، ''اسرائیل نہ رہا تو ہم میں سے کوئی بھی باقی نہ رہے گا''۔ امریکا میں یہودی لابی کے معروف ادارے جے سٹریٹ میں بھی دہائی دی جارہی ہے کہ ہمیں فلسطینیوں کے ساتھ فوری طور پر صلح کرلینی چاہیے، وگرنہ اسرائیل کا وجود خطرات سے دوچار ہوجائے گا۔ (اسرائیل ٹوڈے، ۲۵ مئی ۲۰۱۱ء)

مصر میں مسلم عیسائی فساد

یہ ساری تشویش صرف شام اور لبنان کے مظاہروں کے باعث پیدا ہوئی ہے۔ اُردن میں، جس کی نصف آبادی فلسطینیوں پر مشتمل ہے، ابھی بڑے پیمانے پر مظاہرے نہیں ہوسکے، جو

مظاہرے ہوئے وہ بھی مخصوص علاقوں تک محدود رہے، جب کہ مصر میں عبوری دور کے باعث حکومت اور سیاسی جماعتوں نے انھیں ایک مختلف رُخ دے دیا۔ اس تحریک کو تیسری تحریک انتفاضہ کا نام دیا جارہا ہے، اور اس کے اعلان و انتظام میں مصری نوجوانوں نے بنیادی کردار ادا کیا تھا، لیکن ۱۵مئی آنے سے پہلے مصر میں دو اہم واقعات رُوپذیر ہوگئے۔ ایک تو وہاں اچانک مسلمانوں اور (قبطی) مسیحیوں کے درمیان فسادات شروع ہوگئے۔ ان فسادات کا آغاز اس وقت ہوا جب ایک مسیحی طالبہ عبیر طلعت نے اپنے وڈیو پیغام میں بتایا کہ اس نے اسلام قبول کرلیا تھا، جس کی پاداش میں مسیحی پیشواؤں نے اسے اِمبابہ شہر کے ایک چرچ میں قید کردیا اور اس پر دباؤ ڈالا کہ وہ دوبارہ مسیحی ہونے کا اعلان کرے۔ یہ سن کر بڑی تعداد میں مسلمان نوجوان چرچ کے باہر جمع ہوگئے جس پر عبیر کو رِہا کردیا گیا، لیکن اسی اثنا میں فائرنگ اور خوں ریزی کے واقعات بھڑک اُٹھے۔ کئی جانوں کے ضیاع، توڑ پھوڑ اور آتش زدگی کے نتیجے میں بھاری نقصانات دیکھنے میں آئے۔ بعد میں وزیرداخلہ نے بتایا کہ سب سے پہلے حسنی مبارک کی کالعدم پارٹی کے ایک مسیحی تاجر نے خود اِمبابہ چرچ کے باہر جمع مسلمان نوجوانوں پر فائرنگ کی اور پھر اپنے متعدد غنڈوں کے ذریعے ہلہ بول دیا۔ ان سابق حکمرانوں کی کوشش تھی کہ پورے ملک میں مسلم مسیحی فسادات بھڑکا دیے جائیں، لیکن بالآخر سیاسی جماعتوں کی کوششوں سے ان فسادات کی آگ پر قابو پالیا گیا۔

الفتح اور حماس کی صلح

دوسرا اہم واقعہ یہ ہوا کہ دو اہم فلسطینی جماعتوں 'الفتح' اور 'حماس' کے درمیان ایک صلح نامہ طے پا گیا۔ حسنی مبارک کے اقتدار میں کئی بار دونوں جماعتوں کے مابین مذاکرات ہوئے، کئی بار صلح نامے کے مسودے تیار ہوئے، لیکن ہر بار صلح کی کوششیں ناکام رہیں۔ اس مرتبہ نہ لمبے چوڑے مذاکرات کے دور چلے، نہ ذرائع ابلاغ میں کوئی شور سنائی دیا۔ اچانک معلوم ہوا کہ 'حماس' اور 'الفتح' نے قاہرہ میں صلح کے جامع معاہدے پر دستخط کردیے ہیں۔ مصری عوام نے اس مناسبت سے ۱۵مئی کو یومِ نکبت یا یومِ وحدت ہی نہیں، بلکہ یوم الوحدۃ والمناصرۃ (یومِ وحدت و نصرت) کا عنوان دے دیا۔

قاہرہ کے میدان التحریر کے علاوہ دیگر کئی شہروں میں بھی لاکھوں کی تعداد میں عوام سڑکوں پر

جمع ہوئے۔ 'مسیحی مسلم بھائی بھائی' اور 'حماس الفتح بھائی بھائی' کے نعروں سے اپنے جذبات کا اظہار کیا اور ساتھ ہی یہ اعلان بھی کیا کہ چونکہ مصر ایک عبوری دور سے گزر رہا ہے، بہت سی اندرونی و بیرونی طاقتیں اب بھی مصری عوام سے ان کی قربانیوں کا ثمر چھیننا چاہتی ہیں، اس لیے ہم کسی کو اس طرح کی سازش کا موقع نہیں دیں گے۔ اعلان کیا گیا کہ ہم ۱۵ مئی کو رفح بارڈر پر جانے کے بجاے ۱۳، ۱۴ اور ۱۵ مئی تینوں دن اہلِ فلسطین کے ساتھ اظہارِ یک جہتی کے لیے ملیونیۃ الفجر (ملین نمازِ فجر) کا اہتمام کریں گے۔ پھر بالفعل یہی ہوا۔ تینوں دن لاکھوں کی تعداد میں عوام قاہرہ کے میدان التحریر اور دیگر میدانوں اور پارکوں میں فجر کے وقت جمع ہوئے اور یومِ نکبت کی سرگرمیوں میں اپنی شرکت کا ایک نیا ایمان افروز رنگ پیش کیا۔ ہزاروں کی تعداد میں مظاہرین قاہرہ میں اسرائیلی سفارت خانے کے سامنے بھی جمع ہوئے۔ انھوں نے وہیں نمازِ فجر ادا کی اور یومِ وحدت ونصرت منایا۔ اب اس بات کا اندازہ لگانا کسی کے لیے بھی مشکل نہیں ہے کہ اگر کسی روز یہی لاکھوں عوام وادیِ سینا عبور کرتے ہوئے رفح بارڈر پر جمع ہوگئے تو تیسری تحریکِ انتفاضہ کیا رُخ اختیار کرسکتی ہے۔ اسرائیلی دانش ور اور بحث وتحقیق کے ادارے اپنے مستقبل کا جائزہ لینے کے لیے مصروشام کے مستقبل کا بھی گہرا مطالعہ کررہے ہیں۔

مصر اور تیونس میں انتخابات

خود اخوان نے اس مرحلے پر بہت محتاط پالیسی اختیار کی ہے۔ اپنا صدارتی اُمیدوار اور ۵۰ فی صد سے زائد نشستوں پر اپنے اُمیدوار نہ لانے کا اعلان اسی پالیسی کا حصّہ ہے، لیکن اس تمام تر احتیاط کے باوجود فلسطین کے بارے میں اپنا موقف پوری قوت وثبات سے پیش کیا جارہا ہے۔ مرشد عام ڈاکٹر محمد بدیع نے اس موقع پر اپنے دو تفصیلی بیانات میں یومِ نکبت اور مسئلۂ فلسطین پر روشنی ڈالی ہے۔ ایک بیان میں فلسطین کے بارے میں اخوان کی تاریخ کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں: ۱۹۲۸ء میں الاخوان المسلمون کی تاسیس کے وقت ہی امام حسن البنا نے مسئلۂ فلسطین کو مرکزی حیثیت دی تھی۔ انھوں نے مئی ۱۹۴۸ء کو لبنان کے شہر عالیہ میں جمع عرب حکمرانوں کو پیش کش کی تھی کہ فلسطین کی آزادی کے لیے اخوان شہادت کے لیے بے تاب اپنے ۱۰ ہزار نوجوان پیش کرنے کے لیے تیار ہیں...... اخوان نے صہیونیوں کے خلاف جہاد میں باقاعدہ حصّہ لیا۔

۲۶ مئی ۱۹۴۸ء کو ایک بہت مشہور معرکہ ''رامات رحیل'' کے مضبوط صہیونی قلعے پر ہوا تھا۔ اخوان کے مجاہدین نے اس میں ۲۰۰/اسرائیلی فوجی قتل کیے...... لیکن ان تمام قربانیوں کے باوجود جنگ بند ہونے کے بعد، ۱۹۴۸ء ہی میں ایک فوجی حکم کے نتیجے میں اخوان پر پابندی لگادی گئی اور پھر ۱۲ فروری ۱۹۴۹ء کو حسن البنا کو شہید کر دیا گیا''۔ اخوان کی یہ تمام قربانیاں کسی سے مخفی نہیں ہیں لیکن اس اہم موقع پر اخوان کے مرشد عام کی طرف سے اس کا ذکر کرنا اس امر کی دلیل ہے کہ احتیاط و حکمت مومن کی شان ہوتی ہے، لیکن اپنے اصولی موقف پر ثابت قدم رہنا بھی کامیابی کی اصل بنیاد ہوتی ہے۔ اب اسرائیلی تجزیہ نگار اپنے عوام کو تسلی دیتے ہوئے کہہ رہے ہیں کہ الاخوان المسلمون کو ۲۰ فی صد سے زیادہ ووٹ نہیں ملیں گے۔ وہ اگر حکومت میں آئے بھی تو یہ ایک مخلوط حکومت ہوگی جس کی ساری پالیسیاں اخوان کے ہاتھ میں نہیں ہوں گی اس لیے خوف زدہ نہ ہوں۔

اس وقت مصر اور تیونس میں اسلامی تحریک کی تمام تر توجہ نئے مرحلے میں اپنا کام منظم و مربوط کرنے پر مرکوز ہے۔ گذشتہ تقریباً نصف صدی سے ان دونوں تحریکوں کو عذاب و ابتلا کا سامنا تھا۔ سارا تنظیمی ڈھانچا اور تمام دعوتی و تربیتی سرگرمیاں زیرِزمین چلی گئی تھیں۔ اب پورا کام دوبارہ برسرِ زمین آرہا ہے۔ اخوان نے ۵۰ سال کے بعد پہلی بار اپنی شوریٰ کا اجلاس علانیہ طور پر کیا ہے۔ اس تاریخی اجلاس میں دیگر امور کے علاوہ اپنی سیاسی جماعت حزب الحریة والعدالة 'آزادی وانصاف پارٹی' کے قیام کی منظوری بھی دی گئی ہے۔

پہلے اخوان کا نام تک غیر قانونی تھا۔ اب انھوں نے قاہرہ کے قلب میں اپنے شان دار مرکز کا باقاعدہ افتتاح کر دیا ہے۔ جون میں الحریة والعدالة پارٹی بھی اپنے مرکز کا باقاعدہ افتتاح کردے گی۔ اخوان کی مجلس شوریٰ میں ہونے والے فیصلوں کے مطابق یہ سیاسی پارٹی اپنی پالیسیوں اور سرگرمیوں میں مکمل طور پر آزاد و خود مختار ہوگی لیکن اپنے اہم فیصلوں میں اخوان سے بھی رہنمائی لے گی۔ پارٹی کے ذمہ داران کا تعین بھی باہم مشاورت سے ہی کیا گیا ہے۔ اخوان کے ایک اہم رہنما محمد مرسی اس کے صدر اور گذشتہ سیشن میں اخوان کے پارلیمانی لیڈر سعد الکتاتنی (۲۰۰۸ء میں مینارِ پاکستان پر منعقدہ جماعت اسلامی کے اجتماعِ عام میں اخوان کی نمایندگی کے لیے آئے تھے) اس کے سیکرٹری جنرل ہوں گے۔ ایک انقلابی اور دُوررس فیصلہ یہ بھی کیا گیا ہے کہ

ایک قبطی مسیحی سیاسی لیڈر رفیق حبیب کو بھی الحریۃ والعدالۃ کے نائب صدور میں شامل کیا گیا ہے جس سے عوام میں یہ تاثر گہرا ہوا ہے کہ یہ جماعت سب مصری عوام کے لیے ہے۔

ادھر تیونس میں بھی انتخابات کی تاریخ قریب تر آتی جارہی ہے۔ ۲۴ جولائی کو ہونے والے عام انتخابات میں شرکت کے لیے اب تک ۶۳ سیاسی جماعتیں رجسٹرڈ ہوچکی ہیں، لیکن ان میں نمایاں جماعتیں انگلیوں پر گنی جاسکتی ہیں۔ تحریک نہضت ان میں سرفہرست ہے۔ بعض جائزہ کار آیندہ اسمبلی میں اس کا حصہ ۵۰ فی صد کے قریب بتارہے ہیں، جب کہ کم از کم بتانے والے بھی یہ تناسب ۲۰ فی صد بتاتے ہیں۔ تیونس میں فرانس اور مصر میں امریکا کی سربراہی میں بیرونی اثرورسوخ بھی نئے سرے سے اپنے پاؤں جمانے کی بھرپور کوشش کررہا ہے۔ صدر اوباما نے اپنے حالیہ تاریخی خطاب میں تبدیل شدہ مصر کو بھی مالی امداد جاری رکھنے کا اعلان کیا ہے۔ مختلف امریکی تحقیقی ادارے تسلسل سے لکھ رہے ہیں کہ عالمِ عرب کی اسلامی تحریکیں ایک حقیقت ہیں، ہمیں ان کے ساتھ تعاون کی راہ نکالنا ہوگی۔ لیکن بدقسمتی سے یہ ساری حقیقت پسندی اس وقت کافور ہوجاتی ہے جب معاملہ فلسطین یا اسرائیل کا ہو۔ اسی خطاب میں صدر اوباما نے حماس اور الفتح کی مصالحت پر کڑی تنقید کی ہے اور کہا ہے کہ جو تحریک اسرائیل کا وجود ہی تسلیم نہیں کرتی، الفتح نے اس کے ساتھ کیوں صلح کی۔ ایک مہم یہ بھی چلائی جارہی ہے کہ حماس نے اپنے پروگرام میں اسرائیل نام کی کوئی چیز تسلیم نہ کرنے کا جو اعلان کیا ہوا ہے وہ اسے حذف کردے۔ گویا کہ خود گل ہی بوے گل سے براءت کا اظہار کردے۔

۱۵ مئی کے مظاہروں اور مصروتیونس کے انقلابات نے پوری دنیا کو پیغام دیا ہے کہ ظلم کی طویل رات جس قدر بھی طویل ہوجائے اسے بالآخر چھٹنا ہے۔ خالق کائنات بھی ظالم کی رسی دراز تو کرتا ہے لیکن، جب مقہور و مظلوم نہتے، پُرامن عوام، خوف کا پردہ چاک کرتے ہوئے قربانیوں کے سفر پہ چل نکلیں تو تمام فرعونی نظام ریت کی دیوار ثابت ہوتے ہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی جانب رہنمائی فرمائی تھی کہ وہن، یعنی ''دنیا سے محبت اور موت سے نفرت'' تمھارا وتیرا ہوگا۔ تو جھاگ کی طرح کثیر تعداد میں ہونے کے باوجود ساری دنیا تم پر بھوکوں کی طرح پل پڑے گی۔ آج یہ حدیث نبوی مدرسۂ رسالت کی سچائی پر گواہی دینے کے ساتھ ساتھ مظلوم و مقہور قوم کے لیے راہ نجات بھی واضح کررہی ہے۔

ڈنمارک میں مسلم اقلیت کا مسئلہ

محمد علی

ڈنمارک شمال مغربی یورپ میں واقع ہے۔ اس کے ہمسایہ ممالک میں سویڈن، ناروے اور جرمنی شامل ہیں۔ اس کے دارالحکومت کا نام کوپن ہیگن ہے۔ اس کی آبادی تقریباً ۵۵ لاکھ ہے، جب کہ اس میں مقیم مسلمانوں کی تعداد اڑھائی لاکھ کے قریب ہے۔ یہاں بسنے والے مسلمانوں میں اکثریت عربوں، ترکوں اور پاکستانیوں کی ہے، جب کہ کچھ عرصے سے صومالیوں کی تعداد بھی بڑھ رہی ہے۔ ڈنمارک میں ۱۸۴۹ء سے علامتی طور پر دستوری بادشاہت ہے، جب کہ نظام ریاست چلانے کے لیے پارلیمانی جمہوری نظام رائج ہے، جس میں پارلیمنٹ بالا دست ہے۔

ڈنمارک کا شمار ایک فلاحی ریاست (welfare state) میں ہوتا ہے، جہاں بنیادی ضروریات مفت فراہم کرنا ریاست کی ذمہ داری ہے، مثلاً تعلیم، صحت، بے روزگاری کی صورت میں وظائف وغیرہ (اگرچہ اب ان سہولیات میں بتدریج کمی واقع ہو رہی ہے)۔ لہٰذا اس ملک کا پبلک سیکٹر کافی وسیع ہے، لیکن کچھ تبدیلیاں لائی جا رہی ہیں اور مختلف شعبہ جات میں نج کاری کا دائرہ وسیع کیا جا رہا ہے۔ دیگر مغربی ممالک کی طرح آج ڈنمارک کو بھی معاشی مسائل کا سامنا ہے۔

۱۹۷۰ء کے عشرے میں روزگار کے لیے مسلم ممالک سے بھی لوگ ڈنمارک آنے لگے اور اکثر ایسے کام کاج سنبھال لیے، جو خود ڈینش بھی کرنا پسند نہیں کرتے، یعنی شعبۂ خدمت میں۔ پھر ان محنت کش پردیسی مسلمانوں نے اپنے اہل خانہ کو بھی بلانا شروع کر دیا اور یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ ان کے بچوں نے یہیں پرورش پائی اور ڈینش سکولوں و کالجوں میں تعلیم حاصل کی۔ چنانچہ عام طور پر ان کی دوسری نسل مغربی تہذیب میں رنگی گئی۔ اگر ان کے والدین کے کچھ اسلامی

رجحانات ہوتے بھی تو زیادہ سے زیادہ انھیں اسلامی رسومات سے متعارف کرا دیتے، لیکن عموماً باقاعدہ اسلامی ذہن سازی نہ ہو پائی۔ نتیجتاً اسلام ان کے لیے چند رسومات یا علامتوں کی حد تک محدود ہو کر رہ گیا، جب کہ فکری طور پر مغربی پیمانے اور اقدار ان کے ذہنوں پر غالب آ گئے۔

۱۹۹۰ء کے عشرے میں اشتراکیت کے انہدام کے بعد اسلام کے خلاف عمومی فضا قائم کرنے کا آغاز ہو گیا تھا لیکن نائن الیون کے بعد یہ رجحان کھل کر سامنے آیا۔ اسی دوران موجودہ ڈینش حکومت بھی برسرِاقتدار آئی جسے دائیں بازو کی انتہا پسند ڈینش عوامی پارٹی کی حمایت حاصل ہے۔

ملک کو معاشرتی مسائل اور بڑھتے ہوئے جرائم کا بھی سامنا ہے، مثلاً بیرونِ ملک سے جسم فروشی کے لیے خواتین کی تجارت، قتل و غارت، چوریاں اور ڈاکے، منشیات اور اس کی منڈی پر قابو کے لیے جرائم پیشہ گروہوں کی لڑائیاں، بچوں سے جنسی زیادتی اور خودکشیوں وغیرہ کے علاوہ نفسیاتی امراض میں روز افزوں اضافہ۔ ان تمام مسائل کے حل میں ناکامی پر انتظامیہ نے، زیادہ تر مسلم اقلیت کو ہدف بنایا۔ بالخصوص، توہین آمیز خاکوں کی اشاعت پر عالمی سطح پر مسلمانوں کی جانب سے ردعمل کے نتیجے میں، مخصوص میڈیا کی جانب سے مسلمانوں کے خلاف ایک منظم مہم برپا کی گئی، اور ڈینش عوام کو مسلمانوں اور اسلام کے خلاف بھڑکانے اور خوف و نفرت کی فضا قائم کی کرنے کی کوششیں ہوئیں۔

ڈینش حکومت کی خلافِ اسلام پالیسی کا اصل ہدف اس معاشرے میں مسلمانوں کو ایک کُل میں جذب کرنا ہے۔ اس مقصد کے لیے ہم آہنگ کرنے یا integration کی اصطلاح استعمال کی جا رہی ہے۔ حالانکہ علمِ عمرانیات میں اس اصطلاح کی تعریف یہ ہے: اکٹھے رہنے کے لیے وہ عمل جس میں مختلف گروہ مشترکہ بنیاد بنائیں۔ اسی کے تحت ڈینش حکومت مسلمانوں کو اپنے معاشرے میں ضم کرنا اور انھیں ڈینش قوم بنانا چاہتی ہے۔ چنانچہ اس کی جانب سے مسلمانوں کی اسلامی شناخت مٹانے کے لیے اقدامات کیے گئے۔ سکولوں میں طلبہ کی ذہن سازی کی جاتی ہے تاکہ وہ ڈینش تاریخ اور مغربی اقدار و نظریات سے مانوس ہوں۔ مسلمانوں کے لیے خاص رول ماڈلز قائم کرنا اور انھیں فروغ دینا تاکہ نوجوان نسل کو ان کا پرستار بنایا جاسکے، مثلاً ایسے 'مسلم' سیاستدان یا گلوکار جو مغربی تہذیب کے دلدادہ ہوں۔ اسی طرح مسلمانوں کی 'ترجمانی' کے لیے جمہوری مسلمان (Demokratiske Muslimer) جیسی جماعت کو تشکیل دینا جس کا مقصد مسلمانوں میں 'مغرب

زدہ اسلام' کا فروغ ہے، تاکہ اجتماعی مسائل میں مسلمان انھی کی طرح سیکولر موقف اختیار کریں۔

ڈنمارک کی جانب سے افغانستان اور عراق پر امریکی قبضے کے لیے وہاں اپنی فوجیں بھیجنے کے علاوہ، خود اس ملک کے اندر بھی انسانی حقوق کی پامالی قابلِ غور ہے۔ ڈنمارک میں انسانی حقوق کا ادارہ (Institute for Menneskerettigheder) کے مطابق ڈنمارک میں انسانی حقوق کی پامالی کئی مرتبہ کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر مسلم خواتین سے حجاب کے مسئلے میں امتیازی سلوک، مسلم ممالک میں شادی کے نتیجے میں اپنے شریکِ حیات کو ڈنمارک بلانے میں قانونی رکاوٹیں کھڑی کرنا، نفرتی جرائم (hate crimes) پر تساہل برتنا، مخصوص علاقوں میں فقط شک کی بنا پر عام لوگوں کو روک کر کھلے عام ان کی تلاشی لینے کا پولیس کا حق، مستحقین کو جائے پناہ دینے سے انکار اور خطرے و جنگ کے باوجود انھیں جبری طور پر اپنے آبائی ممالک کو واپس بھیج دینا وغیرہ۔ اسی طرح حالیہ عدم شہریت کے حامل (فلسطینی مسلم) افراد کو شہریت دینے سے انکار، ڈینش حکومت کی انسانی حقوق کی خلاف ورزی کی فہرست میں شامل ہیں۔

'دہشت گردی' کے بارے میں ڈینش قانون تعزیر کی دفعہ نمبر ۱۱۴ میں لکھا ہے: ''دہشت گردی پر عمر قید کی سزا اُس کے لیے ہے جو قصداً عوام کو انتہائی خائف کرنے یا ناحق طور پر ڈینش یا بیرونی پبلک اتھارٹیز یا کسی بین الاقوامی تنظیم کے کسی فعل کو انجام دینے یا ترک کرنے پر مجبور کرے''۔ پھر شق میں ان مخصوص افعال کا ذکر کیا گیا ہے، مثلاً قتل وغیرہ۔ مگر اس سلسلے میں دل چسپ دفعہ وہ ہے جس میں یہ مذکور ہے کہ وہ شخص جو ان افعال کی دھمکی دے گا وہ بھی ویسے ہی سزا کا مستحق ہوگا، جیسے اس کا مرتکب! نیز اس سلسلے میں وہ قوانین بھی قابلِ ذکر ہیں، جن کے تحت ڈینش خفیہ ادارہ (PET) معلومات حاصل کرنے کے لیے لوگوں کی نجی زندگی میں جاسوسی کرنے کا مجاز قرار دیا گیا ہے، مثلاً فون، میل وغیرہ حتیٰ کہ کمپنیاں بھی پولیس کو مطلوبہ معلومات دینے کی پابند ہیں۔

اسی طرح دفعہ نمبر ۷۸۳ بھی قابلِ غور ہے: ''جب عدالتی سند کے انتظار کی وجہ سے کارروائی کرنے کا موقع گنوایا جا رہا ہو تو پولیس کارروائی کا فیصلہ کرنے کی مجاز ہے''۔ گویا معاملہ اس حد تک بڑھ گیا ہے کہ 'دہشت گردی' کی آڑ میں پولیس بغیر کسی عدالتی سند کے کسی بھی مشکوک شخص کے خلاف کارروائی کر سکتی ہے۔ اسی لیے کچھ ڈینش مبصرین نے اس 'فلاحی ریاست' کو بجا طور پر

’پولیس اسٹیٹ‘ کی مانند قرار دیا ہے۔ یہ بات ناقابلِ فہم ہے کہ بائیں بازو کے وہ انتہا پسند نوجوان جو کئی مرتبہ پولیس سے کھلے عام لڑائیوں اور لوگوں کی ملکیتوں کی غارت گری میں ملوث رہے ہیں، انھیں تو دہشت گردی کی شقوں کے مطابق سزا نہیں دی گئی، جب کہ اُس مسلمان کو انھی شقوں کے تحت نو سال قید کی سزا سنائی گئی ہے، جس نے توہین آمیز خاکے بنانے والے پر قاتلانہ حملہ کیا تھا! یہ بات سمجھ سے باہر ہے کہ فردِ واحد پر حملے کو ریاستی سلامتی کے خطرے سے کیسے تعبیر کیا جاسکتا ہے!

ان حربوں کے باوجود بھی الحمدللہ مسلمان بالعموم دین اسلام پر کاربند ہیں اور ان کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ تاہم ایسے منصوبے بنتے رہیں گے خواہ ان کی نوعیت کتنی ہی مختلف ہو۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمْ لِیَصُدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَسَیُنْفِقُوْنَھَا ثُمَّ تَکُوْنُ عَلَیْھِمْ حَسْرَۃً ثُمَّ یُغْلَبُوْنَ ط وَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اِلٰی جَھَنَّمَ یُحْشَرُوْنَ o (الانفال ۸:۳۶) ”بلاشبہ کافر لوگ اپنے مالوں کو اس لیے خرچ کر رہے ہیں کہ اللہ کی راہ سے روکیں، سو یہ لوگ تو اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہی رہیں گے، پھر وہ مال ان کے حق میں باعثِ حسرت ہو جائیں گے، پھر مغلوب ہو جائیں گے اور کافر لوگوں کو دوزخ کی طرف جمع کیا جائے گا“۔

ڈنمارک یا بالعموم مغرب میں اپنی اسلامی شناخت کو برقرار رکھنے کا تقاضا یہ ہے کہ وہاں کے معاشرے اور حکومتی پالیسیوں سے بخوبی واقف رہا جائے، تاکہ مسلمانوں کو اس سے آگاہ اور متنبہ کیا جاسکے۔ مسلمان انٹی گریشن (ہم آہنگی) کے لیے جس حد تک اسلام خود ڈینش یا مغربی معاشرے سے تعامل (interaction) کی اجازت دیتا ہے، وہ اس کی پابندی کریں۔ اسی طرح اسلام کی دعوت پیش کرنے کے لیے اسلام کا گہرا علم لازمی ہے، تاکہ اسلامی نظریات کو موجودہ واقعات پر منطبق کرتے ہوئے، وہاں کے حالات میں حکمت عملی وضع کر کے کام کرنے والی فعال اسلامی تحریک برپا کی جاسکے۔ اس کے لیے قابل مسلمان نوجوانوں پر مشتمل ایک ایسی تنظیم کی ضرورت ہے، جو ایک طرف یہاں پر مسلمانوں کے مسائل کو اچھی طرح سمجھتے ہوئے انھیں اُجاگر کرسکے، اور دوسری طرف اس کے ارکان اسلامی تعلیمات سے آراستہ ہوں تاکہ صرف مسلمانوں کو ہی نہیں بلکہ مؤثر طریقے سے وہاں کے غیر مسلم شہریوں کو بھی اسلام کی دعوت پہنچا سکیں۔ یوں وہ ڈینش معاشرے کو اسلام سے مالا مال بھی کریں گے اور اس کی خدمت بھی۔

انٹرنیشنل یوتھ لیڈر شپ کیمپ

(برائے طالبات)



15 تا 25 جولائی 2011ء بمقام مری ہلز

GET
GHAZALI EDUCATION TRUST

"نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر"

غزالی ایجوکیشن ٹرسٹ ...... 351 سکولز اور 5 خواتین کالجز میں زیرِ تعلیم 40 ہزار سے زائد طلبہ و طالبات اور 1927 اساتذہ کرام کی تعلیم و تربیت کا 15 سالہ وسیع تجربہ رکھتا ہے۔

تعلیم و تربیت کے میدان میں اپنے دائرہ کار کو وسیع کرتے ہوئے سال 2011ء میں تارکین وطن (خصوصاً خلیجی ممالک میں مقیم) پاکستانیوں کی بچیوں کے لئے "انٹرنیشنل یوتھ لیڈر شپ کیمپ" کا انعقاد کیا جارہا ہے۔

زیر نگرانی:

- ڈاکٹر اشتیاق احمد گوندل
  وائس پریذیڈنٹ غزالی ایجوکیشن ٹرسٹ
- ڈاکٹر سمیحہ راحیل قاضی
  ممبر بورڈ آف ڈائریکٹرز

برائے رابطہ:

میاں محمد اسماعیل
فون: +92-345-4688571

عبدالسلام
فون: +92-333-5678009

5-E گلشن برگ، جوہر ٹاؤن لاہور۔
فون: +92-42-35222702,35222705 فیکس: +92-42-35222729
ای میل: info@get.org.pk سائٹ: www.get.org.pk

کیمپ کے مقاصد:

- طالبات کو اسلام کا حقیقی نمائندہ بنانا۔
- ان میں وسعتِ نظر اور خود اعتمادی پیدا کرنا۔
- خواتین سے متعلقہ تمام شعبوں میں قوم کو عمدہ قیادت فراہم کرنا۔

کیمپ کی خصوصیات:

- قرآن، حدیث، اسلامی فقہ، حالات حاضرہ اور لیڈر شپ کے حوالے سے خصوصی لیکچرز
- مری، اسلام آباد اور لاہور کے تعلیمی، تفریحی اور تاریخی مقامات کی سیر
- اسلامی تحاریک کے قائدین کے ساتھ براہ راست تبادلہ خیال

کیمپ کے شرکاء:

- اوورسیز پاکستانی طالبات (خصوصاً خلیجی ممالک میں مقیم)
- عمر کی حد: 14 سال تا 22 سال

رجسٹریشن:

آخری تاریخ:

20 جون 2011ء

رجسٹریشن فارم غزالی ایجوکیشن ٹرسٹ کی ویب سائٹ سے ڈاؤن لوڈ کیا جاسکتا ہے

زرتعاون: 1000 سعودی ریال

زرتعاون کے لئے "غزالی ایجوکیشن ٹرسٹ" کے نام چیک / بنک ڈرافٹ بنا کر رجسٹریشن فارم کے ساتھ منسلک کرکے ہیڈ آفس کے پتہ پر ارسال کریں

لاکھوں زندگیوں میں انقلاب
برپا کرنے والی کتاب
مولانا مودودیؒ کی آواز پوری دنیا میں گونج رہی ہے
یہی آواز انقلاب لائے گی۔ ان شاء اللہ

خُطبات

مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ

- اسلام کا دل نشین، مدلّل اور جامع تعارف
- ایک ایک سطر یقین آفریں، ایمان افزا
- بے شمار دلوں کو نورِ ایمان سے منور کرنے والی کتاب
- اسلام کے بنیادی ارکان کو نہایت آسان زبان میں پیش کیا گیا ہے۔

مولانا سیّد ابو الاعلیٰ مودُودیؒ کی اس زِندہ تحریر کو
گھر گھر پہنچانے کے لیے اپنا کردار ادا کیجیے

قیمت:-/70 روپے

اسلامک پبلی کیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
۱۳۔کورٹ سٹریٹ لوئر مال، لاہور
ہیڈ آفس: منصورہ ملتان روڈ، لاہور پاکستان
042-35417074
Tel: +92-42-37248676-37320961, Fax:+92-42-37214974
E-mails:islamicpak@hotmail.com, islamicpak@yahoo.com website: www.islamicpak.com.pk

بنت مجتبیٰ مینا کی یاد میں

زہرا نہالہ

بیسویں صدی کی دوسری دہائی اپنے اختتام کو پہنچ رہی تھی، شعبان المعظم کا مہینہ تھا۔ یوپی کے شہر بریلی میں نواب مجتبیٰ علی خان کے گھر ایک بچی نے آنکھیں کھولیں۔ اس بچی کے پیدا ہونے پر گھر کے ہر فرد کی آنکھ اشک بار تھی۔ وجہ یہ تھی کہ بچی کے والد اس کی پیدایش سے چھے ماہ قبل محض ۳۵ برس کی عمر میں دنیا سے رخصت ہوچکے تھے۔ اس وقت اس یتیم بچی کی بے نصیبی پر رونے والے یہ نہ جان سکتے تھے کہ خدائے رحمٰن و رحیم اپنی قدرتِ کاملہ سے اس بچی کو خاندان کی سب سے خوش نصیب لڑکی بنا دیں گے اور روے زمین پر ہونے والے سب سے مبارک کام، اعلاے کلمۃ الحق اور شھدا علی الناس کے فریضے میں اس بچی سے مقدور بھر کام لیں گے، اور ۱۹ مئی ۲۰۱۱ء کو جب اپنی بندی کو اپنی طرف واپس بلائیں گے، اس وقت ہزاروں لوگ ان کی جدائی میں آنسو بہانے کے ساتھ ساتھ ان کی خوش نصیبی پر رشک کر رہے ہوں گے___اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ○ (ھود ۱۱:۱۰۷) ''ایسی بخشش ان کو ملے گی جس کا سلسلہ کبھی منقطع نہ ہوگا''۔

میری والدہ (مریم بیگم جنھیں لوگ بنت مجتبیٰ مینا کے نام سے جانتے ہیں) نے ساری زندگی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پیدایشی یتیم ہونے کی نسبت کو اپنا سرمایۂ جاں سمجھا۔ وہ کہا کرتیں کہ جب میں سورۃ ضحیٰ کی یہ آیات: اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى ○ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ○ وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى ○ (کیا اس نے تم کو یتیم نہیں پایا اور پھر ٹھکانا فراہم کیا؟ اور تمھیں ناواقف راہ پایا اور پھر ہدایت بخشی۔ اور تمھیں نادار پایا اور پھر مال دار کر دیا۔ الضحیٰ ۹۳:۶-۸)، پڑھتی ہوں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میرا رب مجھ ہی سے مخاطب ہے۔

میں جب اپنی امی کی زندگی پر ایک غائرانہ نگاہ ڈالوں تو مہربان رب کے انتظامات دیکھ کر دل احساسِ تشکر سے معمور ہوجاتا ہے۔ امی کا تعلق ایک ایسے خاندان سے تھا جس میں سیاسی بیداری، انگریز سے نفرت اور اپنی دینی اقدار کی حفاظت کا احساس کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ امی کے دادا نواب شفیع علی خاں کا تعلق صاحبِ حیثیت مسلمانوں کے اس گروہ سے تھا جنھوں نے انگریز سے وفاداری کا تعلق استوار کرنے کے بجاے بغاوت کا راستہ اپنایا تھا۔ نتیجے میں تمام جایداد، مال اسباب ضبط ہوگیا تھا اور الٰہ آباد کے خسرو باغ میں پھانسی کا حکم سننے والوں میں شامل تھے۔

اس سیاسی بیداری اور دین سے محبت کا تسلسل مسلم لیگ سے والہانہ تعلق کی صورت میں ظاہر ہوا۔ امی کے بچپن میں جب قائداعظم محمدعلی جناح تحریکِ پاکستان کے دوران یوپی کا طوفانی دورہ کر رہے تھے تو امی کے چچا نواب سخاوت علی خان صاحب نے اپنے گھر کے احاطے میں مسلم لیگ کا جلسہ منعقد کروایا۔ امی کے بڑے بھائی نے ایک ریشمی رومال پر پاکستان کا نقشہ بنایا جسے امی کی چچازاد بہن نے کاڑھ کر قائداعظم کی خدمت میں پیش کیا تھا۔

حساس دل، مسلمانوں کے لیے کچھ کرنے کی تڑپ رکھنے والی، فطری ادبی و تخلیقی صلاحیتوں سے مالا مال اس لڑکی کو اللہ رب العزت نے اپنی ایک صالح بندی محترمہ آپا حمیدہ بیگم تک پہنچانے کا بندوبست اس طرح کیا کہ ۱۹۵۲ء میں امی اپنی والدہ اور بھائی کے ہمراہ پاکستان ہجرت کر کے آگئیں۔ امی اپنے تایازاد بھائی جناب ناصر سلطان علی خان کو اپنا بہت بڑا محسن اس لیے سمجھتی تھیں کہ نہ صرف انھوں نے اپنی چچی (امی کی والدہ کو) اپنے ساتھ رہنے پر آمادہ کیا بلکہ جماعت اسلامی سے تعارف اور تعلق کی بنیاد بھی بنے۔

ناصر سلطان صاحب سول انجینیر تھے اور محکمہ انہار میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ ملازمت کے سلسلے میں وہ پانچ سال بہاول نگر رہے۔ یہیں سے امی نے جماعت اسلامی کے ساتھ عملی کام کی ابتدا کی اور بہاول نگر میں حلقۂ خواتین کی داغ بیل ڈالی۔ اسی زمانے میں تسنیم اور کوثر میں امی کا کلام چھپنا شروع ہوا۔ محترم نصراللہ خاں عزیز نے امی کی بے حد حوصلہ افزائی کی اور کئی دفعہ امی کی نظمیں سرورق پر بھی چھاپیں۔ یہاں ایک دفعہ پھر خوش قسمتی نے امی کا دامن تھاما اور ان کے لکھے ہوئے مضامین و اشعار محترمہ آپا حمیدہ بیگم کی نظر میں آگئے۔ انھوں نے فوری طور پر ان سے

قلمی تعلق قائم کیا اور ان کو اپنی محبت کی زنجیر میں ایسا جکڑا کہ وہ اپنی زندگی کے آخری زمانے تک اس محبت و شفقت و تربیت کی اسیر رہیں۔ ۱۹۵۲ء سے لے کر ۱۹۵۷ء تک یہ تعلق (سوائے چند ملاقاتوں کے) قلمی طور پر قائم رہا۔ امی اس تعلق کو اپنے الفاظ میں یوں بیان کرتی ہیں کہ ایک نرم دل مصوّرہ نے اپنا برُش اُٹھایا اور بڑی خوب صورتی سے میری شخصیت میں رنگ بھرنا شروع کیے۔ آپا حمیدہ بیگم نے ایک دفعہ ان کو خط میں لکھا: ''مجھے بار بار آپ ہی کا خیال آتا ہے کہ آپ کی زندگی اچھی طرح گزرے۔ آپ اپنی شاعری کی وجہ سے لوگوں کا کھلونا نہ بن جائیں۔ حضرت فاطمہ بھی شاعرہ تھیں لیکن ان کی شاعری اپنے باپ کی محبت اور اطاعت کے لیے وقف تھی۔ پھر ان کی زندگی، دل چاہتا ہے کہ آپ کی زندگی میں بھی وہی چیز ہو''۔

آگے مزید لکھتی ہیں: ''میرا خیال ہے جس کسی کو کسی شاعر سے سچّی محبت ہوگی وہ اس کو یہی مشورہ دے گا کہ اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کو اسلام کی راہ میں لگاؤ۔ اس کی حدود کا پابند بناؤ۔ اس وقت مجھے حلقۂ خواتین کی طرف سے دو جہاد بڑے اہم دکھائی دیتے ہیں۔ ایک تو گھریلو زندگی اختیار کرنے پر رضامند ہوجانا اور دوسرے بچوں کی صحیح تعلیم و تربیت کے لیے پوری طرح تیار ہوجانا۔ علمی ادبی کام اپنی جگہ بہت اہمیّت رکھتا ہے لیکن بنیادی نہیں۔ بنیادی مسئلہ یہی ہے کہ ہمارا اصل مالک، ہمارا سب سے بڑا محسن، سب سے بڑا خیر خواہ اور ہماری محبت کا سب سے بڑھ کر جواب دینے والا ہم سے کیا چاہتا ہے کہ ہم کیسی زندگی گزاریں؟ اور پھر اس کے عائد کردہ فرائض کو نبھانا''۔

انھوں نے اپنی مُرشد کی باتوں کو ایسی عقیدت سے تسلیم کیا کہ کبھی بطور شاعرہ اپنے کیریئر کو نہ اہم سمجھا نہ اس کے لیے محنت کی۔ اشعار وہ ساری زندگی ضرور کہتی رہیں مگر وہ بھی بتول اور نور کی ہی زینت بنے۔ ۱۹۵۷ء میں اپنی شادی کے بعد انھوں نے اپنے آپ کو تن من دھن سے گھر کے محاذ پر مصروف کرلیا اور ایک قابلِ رشک شریکِ حیات، بامروت، متحمل مزاج بہو اور ایک آئیڈل ماں بن کر دکھایا، الحمدللہ۔

۱۹۵۷ء سے ۱۹۷۳ء تک امی نے لاہور میں سسرال ہونے کے باعث آپا حمیدہ بیگم کی صحبت سے فیض اُٹھایا۔ 'نئی نسل کی تربیت' امی کی ترجیحات میں سرفہرست تھی۔ اسی لیے آپا حمیدہ بیگم نے نور رسالے کی ذمہ داری ان کے سپرد کردی۔ اللہ کی خاص رحمت سے کم و بیش ۳۵ سال تک

انھوں نے اس رسالے کی ادارت کا فریضہ سرانجام دیا (ان کا دن گھر کے کاموں اور جماعت کے کاموں کے لیے مختص تھا تو راتیں نور کے کام کے لیے)۔ چند برسوں سے بڑھاپے اور خرابیِ صحت کے باعث انھوں نے یہ کام چھوڑ دیا تھا مگر صد شکر کہ اللہ کی مہربانی سے ان کی اکلوتی بہو ذروہ احسن نے جو آپا سعیدہ احسن کی بیٹی اور آپا بنت الاسلام کی بھانجی بھی ہیں، اس کام کو بہت اچھے طریقے سے سنبھالا ہوا ہے۔

لاہور میں انھوں نے اپنی ازدواجی زندگی کے ۴۰ سال گزارے۔ میرے والد محترم عبدالسلام خان امی کے لیے نیک طینت شوہر کے ساتھ ساتھ جماعتی محاذ پر بھی ہم مزاج ساتھی اور بہترین رفیقِ کار ثابت ہوئے۔ جب میں نے ہوش سنبھالا تو اباجی مرحوم کو حلقۂ خواتین کا نگران اور والدہ کو جماعت میں ادبی، دعوتی، تنظیمی اور سیاسی محاذوں پر ہمہ وقت سرگرم پایا۔ میری والدہ میرے فطری میلان کو دیکھتے ہوئے باوجود کم عمر ہونے کے مجھے اکثر اپنے ساتھ رکھتیں۔ ۱۹۷۷ء کی تحریک نظامِ مصطفیؐ سے لے کر ۱۹۸۵ء میں غیر جماعتی بنیادوں پر ہونے والے الیکشن تک، میری آنکھوں میں اپنی والدہ اور والد کی سرگرمیاں اور مصروفیات ایک فلم کی صورت میں گھوم رہی ہیں۔ کبھی جلوس پر گولی چلائے جانے کے نتیجے میں زخمیوں کو دیکھنے ہسپتال جایا جارہا ہے۔ کہیں جلسۂ عام میں خطاب ہو رہا ہے۔ کہیں لوگوں کو بیلٹ پیپر پر صحیح طریقے سے مہر لگانے کا طریقہ بتایا جا رہا ہے۔ کبھی وارڈز اور زون کی فائلیں بنائی جارہی ہیں۔ کبھی ووٹر لسٹوں کی پڑتال ہو رہی ہے۔ کبھی پولنگ ایجنٹوں کو بریفنگ دی جارہی ہے۔ این اے ۸۵ کے گلی کوچوں کا چپہ چپہ روزِ قیامت ان شاء اللہ میری والدہ کے قدموں کی گواہی دے گا۔ نواز شریف کے مقابلے میں سید اسعد گیلانی تھے۔ اس انتخابی مہم میں امی اور اباجی کا انہاک، لگن، محنت اور تگ و دو دیکھنے سے تعلق رکھتے تھے۔

۸۰ کی دہائی میں میری والدہ محترمہ بیگم زبیدہ واصل کے ساتھ میونسپل کارپوریشن لاہور کی کونسلر بھی رہیں۔ حریم ادب کی محفل کا بھی دوبارہ سے اجرا کیا۔ اسلامی جمعیت طالبات سے خصوصی تعلق رکھنے کے باعث جمعیت کے پروگراموں اور مشاعروں میں ہمیشہ شرکت کی۔ جماعت اسلامی کی خواتین کی نمایندگی کرتے ہوئے ایوانِ صدر بھی گئیں۔ سیرت کانفرنسوں اور خواتین کانفرنسوں میں بھی شریک رہیں۔ جنگ فورم میں حدود آرڈی ننس پر اعتراضات کے حوالے سے حنا جیلانی،

عاصمہ جہانگیر اور مہناز رفیع جیسی خواتین کے مقابل بھی ڈٹی رہتیں۔ مقابل باوجود ڈھٹائی کے ان کے باوقار اور پُرسکون انداز سے مرعوب ہوئے بغیر نہ رہتا۔

۱۹۸۹ء میں مینارِ پاکستان پر ہونے والا اجتماعِ عام غالباً وہ آخری پروگرام تھا جس میں امی اور اباجی نے اپنے روایتی جوش وخروش سے حصہ لیا۔ قیمہ کے کیمپ میں بطور نائب قیمہ پاکستان ان کی موجودگی اور تمام پاکستان سے آئی ہوئی خواتین کا ان سے والہانہ ملنا آج بھی میرے دل کے البم میں محفوظ ہے۔

اس کے بعد امی نے دورِ آزمایش بھی دیکھا۔ غلط فہمیوں، خدشات، بدگمانیوں کی کچھ ایسی ہوا چلی کہ والدہ کے عزیز از جان شریکِ حیات اور امی کی دیرینہ ساتھی مخالف کیمپ میں جا کھڑے ہوئے۔ لیکن اس موقع پر بھی انھوں نے اپنی فہم وفراست کے مطابق جس بات کو اور موقف کو درست سمجھا اس پر قائم رہیں۔

۱۹۹۷ء میں میرے والد اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رٰجِعُوْن۔ اس اصولی اختلاف کے باوجود امی نے اباجی کی خدمت اور خیال رکھنے میں ذرہ برابر کمی نہ آنے دی اور ان کی رحلت کے بعد بھی جنت الفردوس میں ان سے ملاقات کی دعائیں کرتی رہیں۔ امی کا کہنا تھا کہ ''اللہ رب العالمین ہر ایک سے اس کی نیت کے مطابق معاملہ کرے گا اور میں گواہی دیتی ہوں کہ تمھارے والد ایک نیک آدمی تھے''۔

میرے شوہر ڈاکٹر عاصم پلاسٹک سرجری کے ایف سی پی ایس پارٹ ٹو کی ٹریننگ کے سلسلے میں چار سال لاہور میں میوہسپتال میں تعینات رہے۔ ۱۹۹۶ء سے ۲۰۰۱ء تک مَیں امی کے ساتھ ہی رہی۔ جب ہماری فیصل آباد واپسی کا وقت ہوا تو والدہ نے کمالِ ہمت سے اپنے گھر کو ہمیشہ کے لیے بند کرنے کا فیصلہ کیا۔ اپنی زندگی کے آخری ۱۰ سال انھوں نے اپنے بیٹے کے پاس گزارے۔ کبھی کراچی، کبھی اسلام آباد (گو دل میں لاہور اور اہلِ لاہور کی یاد آخر وقت تک چٹکیاں لیتی رہی)۔

یہ بھی حُسنِ اتفاق ہے کہ ۲۰۰۱ء تک امی نے عملی طور پر جماعت میں کام کیا اور اسی سال سے مَیں نے ان کی دیرینہ خواہش کے پیش نظر جماعت اسلامی میں عملی طور پر اپنا سفر شروع کیا۔ وہ جب بھی فیصل آباد آتیں، نہ صرف جماعت کے پروگراموں میں شریک ہوتیں بلکہ حریم ادب کا

انعقاد بھی کرواتیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی زندگی کا آخری حصہ بہت سکون، آسانی اور خوشی کے ساتھ گزروایا۔ وہ کبھی کسی کے لیے وجۂ تکلیف نہ بنیں (الحمدللہ)۔ آخر وقت تک جماعت اور جماعت کے کاموں سے ان کا دلی تعلق رہا۔

۲۲مارچ کو وہ دبئ بڑی بہن کے پاس ان کے شدید اصرار کے نتیجے میں گئی تھیں۔ انٹرنیٹ پر گاہے بہ گاہے ان سے طویل گفتگو رہتی۔ آخری دفعہ غالباً ایک ہفتہ پہلے ان سے بات کی تو حسبِ معمول شگفتہ انداز میں بات کرتی رہیں۔ الوداع کہتے ہوئے اپنا پسندیدہ شعر دُہرایا ؎

خیری کن ای فلاں و غنیمت شمار عمر
زاں پیشتر کہ بانگ در آید فلاں نماند

اللہ نے ان کی خواہش کے مطابق ان کو چلتے ہاتھ پیر، آخر وقت تک کی نماز پڑھوا کر اور بے ہوش ہونے سے پہلے تک کلمۂ طیبہ پڑھواتے ہوئے اپنے پاس بلایا۔ ان کے انتقال کی خبر سن کر سب مجھے صبر کی تلقین کر رہے ہیں، ان کے نیک اعمال اور کردار کی گواہی دے رہے ہیں اور ان کے بلند درجات کی دعائیں کر رہے ہیں۔ لیکن میرا دل امی کے اس شعر کی تصویر بنا ہوا ہے ؎

گرداب سے بچنا مانجھی تم، پتوار سنبھالو نیا کے
اب ہر چہ بادا باد کہو کشتی سے کنارا چھوٹ گیا

☆مضمون نگار بیٹھک اسکول، فیصل آباد کی نگران ہیں

خریداروں سے گزارش

- ......دفتری امور کے بارے میں خط و کتابت کرتے ہوئے خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجیے۔
- ......ڈاک کی بہتر اور یقینی ترسیل کے لیے اپنے پوسٹل کوڈ سے ایس ایم ایس کے ذریعے آگاہ فرمائیے۔

(ادارہ)

میں نے فطرت کو پالیا!

بھارت کی ہاکی کھلاڑی کا قبولِ اسلام

قبولِ اسلام سے قبل عفیفہ ایک آزاد خیال ہندولڑکی اور ہاکی کی کھلاڑی تھی۔مگر جب اس نے اسلام کوفطرت کے قریب اوراپنے ضمیر کی آواز پایا تو اسے قبول کرلیا۔قبولِ اسلام کے بعد معروف مبلغ محمد کلیم اللہ صدیقی کی بیٹی اسما نے ان سے انٹرویو کیا جو پیش ہے۔(ادارہ)

○ ہمیں بتایا گیا تھا کہ ہندستان کی ایک ہاکی کھلاڑی آرہی ہیں تو ہم سوچ رہے تھے کہ آپ ہاکی کے ڈریس میں آئیں گی، مگر آپ ماشاء اللہ برقع میں ملبوس، اور دستانے پہن کر مکمل پردے میں ہیں۔ آپ اپنے گھر سے برقع اوڑھ کر کیسے آئی ہیں؟

● الحمدللہ میں پچھلے دو ماہ سے شرعی پردے میں رہتی ہوں۔

○ ابھی آپ کے گھر میں تو کوئی مسلمان نہیں ہوا؟

● جی، میرے گھر میں ابھی میرے علاوہ کوئی مسلمان نہیں ہے۔ اس کے باوجود میں الحمدللہ کوشش کرتی ہوں کہ میں اگرچہ گھر میں اکیلی مسلمان ہوں مگر میں آدھی مسلمان تو نہ بنوں، آدھی اِدھر، آدھی اُدھر، یہ تو نہ ہونا چاہیے۔

○ آپ کو ہاکی کھیلنے کا شوق کیسے ہوا، یہ تو بالکل مردوں کا کھیل ہے؟

● اصل میں، مَیں ہریانہ کے سونی پت ضلع کے ایک گاؤں کی رہنے والی ہوں۔ ہمارے گھر میں سبھی مرد پڑھے لکھے ہیں اور اکثر کبڈی کھیلتے ہیں۔ میں نے اسکول میں داخلہ لیا اور ابتدا ہی سے کلاس میں ٹاپ کرتی رہی۔ سی بی ایس ای بورڈ میں میری ہائی اسکول میں گیارھویں پوزیشن

رہی۔ مجھے شروع ہی سے مردوں سے آگے نکلنے کا شوق تھا، اس کے لیے میں نے اسکول میں ہاکی کھیلنا شروع کی۔ پہلے ضلع میں نویں کلاس میں سلیکشن ہوا، پھر ہائی اسکول میں ہریانہ اسٹیٹ کے لیے لڑکیوں کی ٹیم میں میرا اسلیکشن ہوگیا۔ ۱۲ویں کلاس میں بھی میں نے اسکول میں ٹاپ کیا اور سی بی ایس ای بورڈ میں میرا نمبر ۱۸واں رہا۔ اسی سال میں خواتین کی بھارتی ہاکی ٹیم میں منتخب ہوگئی۔ عورتوں کے ایشیا کپ میں بھی کھیلی اور بہت سے ٹورنامنٹ میری کارکردگی کی وجہ سے جیتے گئے۔ اصل میں ہاکی میں بھی سب سے زیادہ فعال کردار سنٹر فارورڈ کا ہوتا ہے، یعنی سب سے آگے درمیان میں کھیلنے والے کھلاڑی کا۔ میں ہمیشہ سنٹر فارورڈ پوزیشن پر کھیلتی رہی۔ مردوں سے آگے بڑھنے کا جنون تھا، مگر روزانہ رات کو میرا جسم مجھ سے شکایت کرتا تھا، کہ یہ کھیل عورتوں کا نہیں ہے۔ مالک نے اپنی دنیا میں ہر ایک کے لیے الگ کام دیا ہے۔ ہاتھ پاؤں بالکل شل ہوجاتے تھے، مگر میرا جنون مجھے دوڑاتا تھا اور اس پر کامیابی اور واہ واہ مجھے فطرت کے خلاف دوڑنے پر مجبور کرتی تھی۔

○ اسلام قبول کرنے سے پہلے تو آپ کا نام پریتی تھا؟

● حضرت کلیم صدیقی نے میرا نام عفیفہ، ابھی یعنی کچھ ماہ پہلے رکھا ہے۔

○ آپ کے والد کیا کام کرتے ہیں؟

● وہ سی بی ایس ای بورڈ کا ایک اسکول چلاتے ہیں، اس کے پرنسپل ہیں۔ میرے ایک بڑے بھائی اس میں پڑھاتے ہیں، میری بھابی بھی پڑھاتی ہیں۔ وہ سب کھیل سے دل چسپی رکھتے ہیں، میری بھابی بیڈمنٹن کی کھلاڑی ہیں۔

○ ایسے آزاد ماحول میں زندگی گزارنے کے بعد ایسے پردے میں رہنا آپ کو کیسا لگتا ہے؟

● انسان اپنی فطرت سے کتنا ہی دُور ہوجائے اور کتنے زمانے تک دُور رہے، جب بھی وہ اس کی طرف پلٹتا ہے تو وہ کبھی اجنبیت محسوس نہیں کرے گا۔ وہ ہمیشہ محسوس کرے گا کہ اپنے گھر لوٹ آیا۔ اللہ نے عورتوں کی فطرت مردوں سے بالکل الگ بنائی ہے۔ بنانے والے نے عورت کو چھپنے اور پردہ میں رہنے کے لیے بنایا۔ اسے سکون اور چین، لوگوں کی ہوس بھری نگاہ سے بچے رہنے

میں ہی مل سکتا ہے۔ اسلام دین فطرت ہے، جس کے سارے حکم انسانی فطرت سے میل کھاتے ہیں، مردوں کے لیے مردوں کے فطرت کی بات، اور عورتوں کے لیے عورتوں کی فطرت کی بات۔

○ آپ کی عمر کتنی ہے؟

● میری تاریخ پیدایش جنوری ۱۹۸۸ء ہے، گویا ۲۲ سال۔

○ مسلمان ہوئے کتنے دن ہوئے؟

● ساڑھے چھے مہینے کے قریب ہوئے ہیں؟

○ آپ کے گھر میں آپ کے اتنے بڑے فیصلے پر مخالفت نہیں ہوئی؟

● ہوئی اور خوب ہوئی، مگر سب جانتے ہیں کہ عجیب دیوانی لڑکی ہے، جو فیصلہ کرلیتی ہے پھر اس سے پیچھے نہیں ہٹتی۔ اس لیے شروع میں ذرا سختی ہوئی مگر جب اندازہ ہوگیا کہ میں دُور تک جاسکتی ہوں تو سب موم ہوگئے۔

○ آپ ہاکی اب بھی کھیلتی ہیں؟

● نہیں، اب میں نے ہاکی چھوڑ دی ہے۔

○ اسے تو گھر والوں نے بہت محسوس کیا ہوگا؟

● ہاں، مگر فیصلہ لینے کا حق مجھے تھا۔ میں نے فیصلہ لیا اور میں نے اپنے اللہ کا حکم سمجھ کر لیا، اب اللہ کے حکم کے آگے بندوں کی چاہت کیسے ٹھیر سکتی ہے۔

○ آپ کے تیور تو گھر والوں کو بہت سخت لگتے ہوں گے؟

● آدمی کو ڈِھل مِل نہیں ہونا چاہیے۔ اصل میں آدمی پہلے یہ فیصلہ کرے کہ میرا فیصلہ حق ہے کہ نہیں، اور اگر اس کا حق پر ہونا ثابت ہوجائے، تو پہاڑ بھی سامنے سے ہٹ جاتے ہیں۔

○ آپ کے اسلام میں آنے کا ذریعہ کیا چیز بنی؟

● میں ہریانہ کے اس علاقے کی رہنے والی ہوں جہاں کسی ہندو کا مسلمان ہونا تو دُور کی بات ہے، اُلٹا کتنے مسلمان ہیں جو ہندو بنے ہوئے ہیں۔ خود ہمارے گاؤں میں تیلیوں کے بیسیوں گھر ہیں جو ہندو ہوگئے ہیں، مندر جاتے ہیں، ہولی دیوالی مناتے ہیں۔ لیکن مجھے اسلام کی طرف وہاں جاکر رغبت ہوئی جہاں جاکر خود مسلمان اسلام سے آزاد ہوجاتے ہیں۔

○ کہاں اور کس طرح؟ ذرا بتائیں؟

● میں ہاکی کھیلتی تھی تو بالکل آزاد ماحول میں رہتی تھی۔ آدھے سے کم کپڑوں میں ہندستانی روایات کا خیال بھی ختم ہوگیا تھا۔ ہمارے اکثر کوچ مرد رہے۔ مرد ٹیم کے ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔ ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ ٹیم میں ایسی بھی لڑکیاں تھیں جو رات گزارنے بلکہ خواہشات پوری کرنے میں ذرّہ برابر کوئی جھجک محسوس نہیں کرتی تھیں۔ میرے اللہ کا کرم تھا کہ مجھے اس نے اس حد تک نہ جانے دیا۔ گول کے بعد اور میچ جیت کر مردوں عورتوں کا گلے لگ جانا، چمٹ جانا تو کوئی بات ہی نہیں تھی۔ میری ٹیم کے کوچ نے کئی دفعہ بے تکلفی میں میرے کسی شاٹ پر ٹانگوں یا کمر میں چٹکیاں بھریں۔ میں نے اس پر نوٹس لیا اور ان کو وارننگ دی، مگر ٹیم کی ساتھی لڑکیوں نے مجھے بُرا بھلا کہا کہ اتنی سی بات کو دوسری طرح لے رہی ہو، مگر میرے ضمیر پر بہت چوٹ لگی۔

ہماری ٹیم ایک ٹورنامنٹ کھیلنے ڈنمارک گئی۔ وہاں مجھے معلوم ہوا کہ ڈنمارک کی ٹیم کی سنٹر فارورڈ کھلاڑی نے ایک پاکستانی لڑکے سے شادی کر کے اسلام قبول کرلیا ہے، اور ہاکی کھیلنا بھی چھوڑ دیا ہے۔ لوگوں میں یہ بات مشہور تھی کہ اس نے شادی کے لیے اس لڑکے کی محبت میں اسلام قبول کیا ہے۔ مجھے یہ بات عجیب سی لگی۔ ہم جس ہوٹل میں رہتے تھے، اس کے قریب ایک پارک تھا، اس پارک سے ملا ہوا ان کا مکان تھا۔ میں صبح کو اس پارک میں سیر کر رہی تھی کہ ڈنمارک کی ایک کھلاڑی نے مجھے بتایا: وہ سامنے برٹنی کا گھر ہے جو ڈنمارک کی ہاکی کی مشہور کھلاڑی رہی ہے۔ اس نے اپنا نام اب سعدیہ رکھ لیا ہے اور گھر میں رہنے لگی ہے، مجھے اس سے ملنے کا شوق ہوا۔ میں ایک ساتھی کھلاڑی کے ساتھ اس کے گھر گئی۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ کہیں جانے والی تھی، بالکل موزے، دستانے اور پورے برقعے میں ملبوس۔ میں دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئی اور ہم دونوں ہنسنے لگیں۔ میں نے اپنا تعارف کرایا تو وہ مجھے پہچانتی تھی۔ وہ بولی میں نے تمھیں کھیلتے دیکھا ہے۔ سعدیہ نے کہا: 'ہمارے ایک سسرالی عزیز کا انتقال ہوگیا ہے، مجھے وہاں جانا ہے، ورنہ میں آپ کے ساتھ کچھ باتیں کرتی۔ میں تمھارے کھیلنے کے انداز سے بہت متاثر رہی ہوں۔ ہاکی کا کھیل عورتوں کی فطرت سے میل نہیں کھاتا۔ میرا دل چاہتا ہے کہ تمھاری صلاحیتیں فطرت سے رچاؤ رکھنے والے کاموں میں لگیں۔ میں تم سے ہاکی چھڑوانا چاہتی ہوں'۔ میں نے کہا: 'آپ میرے کھیل کے انداز

سے متاثر ہیں اور مجھ سے کھیل چھڑوانا چاہتی ہیں، جب کہ میں تو آپ کا ہاکی چھوڑنا سن کر آپ سے ملنے آئی ہوں کہ ایسی مشہور کھلاڑی ہوکر آپ نے کیوں ہاکی چھوڑ دی؟ میں آپ کو فیلڈ میں لانا چاہتی ہوں'۔ سعدیہ نے کہا: 'اچھا آج رات کو میرے ساتھ کھانے کی دعوت قبول کرو'۔ میں نے کہا کہ آج تو نہیں، کل ہوسکتا ہے، اور یہ طے ہوگیا۔

میں ڈنر پر پہنچی، تو سعدیہ نے اپنے قبولِ اسلام کی روداد مجھے سنائی اور بتایا کہ میں نے شادی کے لیے اسلام قبول نہیں کیا بلکہ اپنی شرم اور اپنی عصمت کی عزت وحفاظت کے لیے اسلام قبول کیا ہے اور اسلام کے لیے شادی کی ہے۔ سعدیہ نہ صرف ایک مسلم خاتون تھی بلکہ اسلام کی بڑی داعیہ تھی۔ اس نے فون کر کے دو انگریز لڑکیوں کو اور ایک معمر خاتون کو بلایا، جو ان کے محلے میں رہتی تھیں، اور سعدیہ کی دعوت پر مسلمان ہوگئی تھیں۔ وہ مجھے سب سے زیادہ اسلام کے پردے کے حکم کی خیر و برکت بتاتی رہیں اور بہت اصرار کر کے مجھے برقع پہنا کر باہر جا کر آنے کو کہا۔ میں نے برقع پہنا۔ ڈنمارک کے بالکل مخالف ماحول میں، میں نے برقعے پہن کر گلی کا چکر لگایا، مگر برقع میرے دل میں اُتر گیا۔ بیان نہیں کرسکتی کہ میں نے مذاق اڑانے یا زیادہ سے زیادہ اُس کی خواہش کے لیے برقع پہنا تھا، مگر مجھے اپنا انسانی قد بہت بڑھا ہوا محسوس ہوا۔ اب مجھے اپنے کوچ کی بے شرمانہ شہوانی چٹکیوں سے گھن بھی آرہی تھی۔ میں نے برقع اُتارا اور سعدیہ کو بتایا کہ مجھے واقعی برقع پہن کر بہت اچھا لگا، مگر آج کے ماحول میں جب برقعے پر مغربی حکومتوں میں پابندی لگائی جارہی ہے، برقع پہننا کیسے ممکن ہے، اور غیر مسلم کا برقع پہننا تو کسی طرح ممکن نہیں؟ وہ مجھے اسلام قبول کرنے کو کہتی رہیں اور بہت اصرار کرتی رہیں۔ میں نے معذرت کی کہ میں اس کے لیے تیار نہیں ہوں۔ ابھی مجھے دنیا کی نمبرون ہاکی کی کھلاڑی بننا ہے، یوں میرے سارے ارمانوں پر پانی پھر جائے گا۔ سعدیہ نے کہا: 'مجھے آپ کو ہاکی کی فیلڈ سے برقعے میں لانا ہے۔ میں نے اپنے اللہ سے دعا بھی کی ہے اور بہت ضد کر کے دعا کی ہے'۔ اس کے بعد ہم ۱۰روز تک ڈنمارک میں رہے۔ وہ مجھے فون کرتی رہی، دوبار ہوٹل میں ملنے آئی، اور مجھے اسلام پر کتابیں دے کرگئی۔

○ آپ نے وہ کتابیں پڑھیں؟

● کہیں کہیں سے دیکھی ہیں۔

○ اس کے بعد اسلام میں آنے کا کیا ذریعہ بنا؟

● میں بھارت واپس آئی۔ ہمارے یہاں نریلا کے پاس گاؤں کی ایک لڑکی (جس کے والد ۱۹۷۴ء میں ہندو ہوگئے تھے، اور بعد میں آپ کے والد مولانا کلیم اللہ کے ہاتھوں مسلمان ہوگئے تھے، ان کی مرید بھی تھے اور حج بھی کر آئے تھے) ہاکی کھیلتی تھی۔ وہ دلی اسٹیٹ کی ہاکی ٹیم میں تھی اور بھارت کی طرف سے منتخب ہونے کے بعد روس میں کھیلنے جانے والی تھی۔ وہ مشورے اور کھیل کے انداز میں رہنمائی کے لیے میرے پاس آئی۔ میں نے اس سے ڈنمارک کی مشہور کھلاڑی برٹنی کا ذکر کیا۔ اس نے اپنے والد صاحب کو ساری بات بتائی۔ وہ اپنی لڑکی کے ساتھ مجھ سے ملنے آئے، اور مجھے حضرت کی کتاب آپ کی امانت اور اسلام ایک پریچے دی۔ آپ کی امانت چھوٹی سی کتاب تھی، بر قعے نے میرے دل میں جگہ بنا لی تھی۔ اس کتاب نے برقع کے حکم کو میرے دل میں بٹھا دیا۔ میں نے حضرت صاحب سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ دوسرے روز حضرت کا پنجاب کا سفر تھا۔ اللہ کا کرنا کہ بہال گڑھ ایک صاحب کے یہاں ہائی وے پر ملاقات طے ہوگئی اور حضرت نے ۱۰، ۱۵ منٹ مجھ سے بات کر کے کلمہ پڑھنے کو کہا، اور انھوں نے بتایا کہ میرا دل یہ کہتا ہے کہ برٹنی نے اپنے اللہ سے آپ کو برقعے میں لانے کی بات منوالی ہے۔ بہرحال میں نے کلمہ پڑھا اور حضرت نے میرا نام عفیفہ رکھا، اور کہا: عفیفہ پاک دامن کو کہتے ہیں۔ چونکہ فطرتاً آپ اندر سے پاک دامنی کو پسند کرتی ہیں، میری بھانجی کا نام بھی عفیفہ ہے، میں آپ کا نام عفیفہ ہی رکھتا ہوں۔

○ اس کے بعد کیا ہوا؟

● میں نے برٹنی کو فون کیا اور اس کو بتایا۔ وہ بہت خوش ہوئی۔ جب میں نے حضرت کا نام لیا تو انھوں نے اپنے شوہر سے بات کرائی۔ ڈاکٹر اشرف ان کا نام ہے۔ انھوں نے بتایا کہ حضرت کی بہن کے یہاں رہنے والی ایک حرا کی شہادت اور اس کے چچا کے قبولِ اسلام کی کہانی سن کر ہمیں اللہ نے اسلام کی قدر سکھائی ہے، اور اسی کی وجہ سے میں نے برٹنی سے شادی کی ہے، یہ کہہ کر کہ اگر تم اسلام لے آتی ہو تو میں تم سے شادی کے لیے تیار ہوں۔ اس کے بعد میں نے اخبار میں اشتہار دیا، گزٹ میں نام بدلوایا، اپنی ہائی اسکول اور انٹر کی ڈگریوں میں نام بدلوایا اور ہاکی سے

ریٹائرمنٹ لے کر گھر پر اسٹڈی شروع کی۔

○ اب آپ کا کیا ارادہ ہے، آپ کی شادی کا کیا ہوا؟

● میں نے آئی سی ایس (انڈین سول سروس) کی تیاری شروع کی ہے۔ میں نے ارادہ کرلیا ہے کہ میں ایک آئی سی ایس افسر بنوں گی اور برقع پوش آئی ایس آئی افسر بن کر اسلامی پردے کی عظمت لوگوں کو بتاؤں گی۔

○ آپ اس کے لیے مطالعہ کر رہی ہیں؟

● میں نیٹ پر اسٹڈی کر رہی ہوں۔ میرے اللہ نے ہمیشہ میرے ساتھ یہ معاملہ کیا ہے کہ میں جو ارادہ کرلیتی ہوں، اسے پورا کردیتے ہیں۔ جب کافر تھی تو پورا کرتے تھے، اب تو اسلام کی عظمت کے لیے میں نے ارادہ کیا ہے، اللہ ضرور پورا کریں گے۔ مجھے ایک ہزار فی صد اُمید ہے کہ میں پہلی بار میں ہی آئی سی ایس امتحانات پاس کرلوں گی۔

○ مگر آپ کے انٹرویو کا کیا ہوگا؟

● برقع اور اسلام کے سارے مخالف بھی اگر انٹرویو لیں گے تو وہ میرے سلیکشن کے لیے ان شاء اللہ مجبور ہوجائیں گے۔

○ گھر والوں کو آپ نے دعوت نہیں دی؟

● ابھی دعا کر رہی ہوں، اور قریب کر رہی ہوں۔ ہمیں ہدایت کیسے ملی؟ ہندی میں مَیں نے گھر والوں کو پڑھوائی۔ سب لوگ حیران رہ گئے، اور اللہ کا شکر ہے کہ ذہن بدل رہا ہے۔

○ کوئی پیغام آپ دیں گی؟

● عورت کا بے پردہ ہونا اس کی حد درجہ توہین ہے۔ مرد خدا کے لیے، اپنے جھوٹے مطلب اور اپنا بوجھ عورتوں پر ڈالنے کے لیے ان کو بازاروں میں بے پردہ پھرا کر ان کی تحقیر و تذلیل سے باز رہیں، اور عورتیں اپنے مقام اور اپنی عصمت و عفت کی حفاظت کے لیے اسلام کے پردے کے حکم کی قدر کریں۔ (بشکریہ ماہنامہ ارمغان، پھلت، ضلع مظفرنگر، یوپی، نومبر ۲۰۱۰ء)



رسائل و مسائل

کیا 'دینِ حق' ناکام رہا ہے؟

سوال: مذاہب کا پروگرام اگر انسانی فطرت کے لیے کشش رکھتا تھا تو متقی لوگوں نے کسی بھی ملک و قوم میں بہتر سوسائٹی بنانے میں کیوں کامیابی حاصل نہیں کی؟ اگر انسانیت کی پوری تاریخ میں بھی مذہب کامیاب نہ ہوسکا تو آج کیوں کر اس سے امن و ترقی کی اُمیدیں وابستہ کی جاسکتی ہیں؟ یہ کہہ دینا کہ انسانی فطرت ہی میں خرابی مضمر تھی، مفید نہیں ہوسکتا۔ مذاہب حق کو زندہ کرنے اور باطل کو مٹانے کے لیے کام کرتے رہے مگر نتیجہ تھوڑے تھوڑے وقفے کو چھوڑ کر ہمیشہ اُلٹا ہی نکلا اور تاریخ کے سیلاب کا رُخ نہ بدلا، یا بالفاظِ دیگر شیطان کی طاقت شکست نہ کھاسکی؟

جواب: آپ کا یہ سوال جتنے مختصر لفظوں میں ہے، اتنے مختصر لفظوں میں اس کا جواب نہیں دیا جاسکتا۔ تاہم اگر محض اشارات سے آپ کی تشفی ہوسکے تو جواب یہ ہے کہ اوّل تو آپ لفظِ مذہب کے نام سے جس چیز کو مُراد لیتے ہیں اس کا تعیّن کریں۔ اگر مذہب کا لفظ آپ جنس کے طور پر استعمال کر رہے ہیں جس میں ہر قسم کے مذاہب شامل ہیں تو اس کی طرف سے جواب دہی کرنا میرا کام نہیں ہے۔ اور اگر مذہب سے آپ کی مراد دین حق، یعنی وہ دین ہے جس کی تعلیم ابتدائے آفرینش سے انسان کی ہدایت کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی جاتی رہی ہے اور جس کا نام عربی زبان میں اسلام ہے، تو وہ مجموعہ ہے اُن اصولوں کا جو کائنات کی واقعی حقیقتوں پر مبنی ہیں اور بجائے خود صحیح ہیں، خواہ انسان ان کو مانے یا نہ مانے۔

ان کی مثال ایسی ہے، جیسے مثلاً حفظانِ صحت کے اصول ہیں کہ وہ انسان کے جسم کی ساخت

اور اس کے اعضا کی حقیقی فعلیت اور اس کے طبعی ماحول کی واقعی حقیقتوں پر مبنی ہیں۔ ان اصولوں کے مطابق کھانا، پینا، سانس لینا، آرام کرنا وغیرہ لازمی طور پر انسان کو تندرست رکھنے کے لیے ضروری ہے۔ اگر کوئی شخص یا ساری دنیا مل کر بھی ان اصولوں کی خلاف ورزی کرے تو نہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ حفظانِ صحت کے اصول باطل ہیں، نہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کی پابندی کرنا انسانی فطرت کا تقاضا نہیں ہے، نہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ اصول ٹوٹ گئے اور شکست کھا گئے، اور نہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ انسانوں کی اس خلاف ورزی نے ان اصولوں کا کوئی نقصان کیا ہے، بلکہ درحقیقت اگر انسان ان اصولوں کے خلاف چلتے ہیں تو یہ ان کی ناکامی ہے اور نقصان ان کا اپنا ہے نہ کہ ان اصولوں کا۔

پس آپ جس چیز کو مذہب کی ناکامی کہہ رہے ہیں، وہ مذہب کی ناکامی نہیں، انسانوں کی ناکامی ہے۔ مثال کے طور پر مذہب ہم کو امانت کی تعلیم دیتا ہے۔ اب اگر تمام دنیا کے انسان مل کر بھی خیانت شروع کر دیں اور امانتوں کو ضائع کرنے لگیں تو کیا آپ یہ کہیں گے کہ مذہب ناکام ہوا؟ مذہب کی ناکامی تو اس صورت میں ہوسکتی ہے، جب کہ یا تو یہ ثابت ہوجائے کہ فطرتِ کائنات اور فطرتِ انسان امانت کی نہیں خیانت کی مقتضی ہے، یا یہ ثابت ہوجائے کہ انسانی زندگی کا حقیقی امن اور تمدنِ انسانی کا قابلِ اعتماد استقلال اور تہذیب کا تسلسلِ ارتقا امانت سے نہیں بلکہ خیانت سے قائم ہوتا ہے۔ لیکن اگر یہ ثابت نہیں ہوتا اور نہیں ہوسکتا تو انسانوں کا امانت چھوڑ کر خیانت کو اختیار کرنا اور اس سے اخلاقی، روحانی اور تمدنی نقصانات اُٹھانا انسانوں کی ناکامی کا ثبوت ہے، نہ کہ 'مذہب' یا دین کی ناکامی کا۔ اسی طرح اور جتنے اصول 'دین' نے پیش کیے ہیں یا بالفاظِ دیگر جن اصولوں کے مجموعے کا نام 'دینِ حق' ہے ان کو جانچ کر دیکھیے کہ وہ حق ہیں یا نہیں؟ اگر وہ حق ہیں تو ان کی کامیابی و ناکامی کا فیصلہ اس بنا پر نہ کیجیے کہ انسانوں نے ان کی پابندی کی ہے یا نہیں۔ انسانوں نے جب ان کی پیروی کی تو وہ خود کامیاب ہوئے اور اگر ان کی پیروی نہ کی تو وہ خود ناکام ہوئے۔ (سید ابوالاعلیٰ مودودی، رسائل و مسائل، سوم، ص ۱۴۵-۱۴۸)

سورۂ توبہ کی ابتدا میں بسم اللہ نہ پڑھنا

س: قرآن مجید کی تمام سورتوں کی ابتدا میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھی جاتی ہے، ماسوا

سورۂ توبہ کے۔ مولانا مودودیؒ لکھتے ہیں کہ ''حضورؐ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں جب قرآن مجید کو مرتب کرنے کا ارادہ کیا گیا تو اس تھیلے کو نکالا گیا اور تمام سورتوں کی ترتیب، جیسے کہ رسولؐ اللہ نے بتائی تھی، وہ قائم رکھ کر ان کی نقل تیار کی گئی۔ توچوں کہ حضورؐ کی لکھوائی ہوئی سورۂ توبہ کے شروع میں بسم اللہ درج نہیں تھی، اس وجہ سے صحابہ کرامؓ نے بھی اسے درج نہیں کیا۔ باقی کوئی سورت قرآنِ مجید کی ایسی نہیں ہے، جس کا آغاز بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے نہ ہوا ہو''۔

دراصل سورۂ توبہ کی ابتدا میں بسم اللہ کیوں نہ پڑھی جائے؟ اس کا سبب تشنہ رہ جاتا ہے۔ ازراہِ کرم اس جانب رہ نمائی فرمائیں یا کسی تفسیر کا حوالہ دیں تاکہ تشنگی دُور ہو سکے۔

ج: تفہیم القرآن ، جلد دوم، سورۂ توبہ کے شروع میں مولانا مودودیؒ نے جو نوٹ لکھا ہے، اس میں 'بسم اللہ نہ لکھنے کی وجہ' کے ذیلی عنوان کے تحت فرمایا ہے: ''اس سورہ کی ابتدا میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نہیں لکھی جاتی۔ اس کے متعدد وجوہ مفسرین نے بیان کیے ہیں، جن میں بہت کچھ اختلاف ہے۔ مگر صحیح بات وہی ہے جو امام رازیؒ نے لکھی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اس کے آغاز میں بسم اللہ نہیں لکھوائی تھی، اس لیے صحابہ کرامؓ نے بھی نہیں لکھی اور بعد کے لوگ بھی اسی کی پیروی کرتے رہے۔ یہ اس بات کا مزید ایک ثبوت ہے کہ قرآن کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جوں کا توں لینے، اور جیسا تھا ویسا ہی اس کے محفوظ رکھنے میں کس درجہ احتیاط و اہتمام سے کام لیا گیا ہے''۔

سورۂ توبہ کے شروع میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کیوں نہیں لکھی گئی؟ اس سلسلے میں مفسرین نے متعدد اقوال نقل کیے ہیں۔ لیکن ان کی حیثیت بس نکات و لطائف کی ہے۔ علامہ قرطبیؒ نے ایک قول یہ نقل کیا ہے کہ اہلِ عرب جب کسی قوم سے کیے ہوئے اپنے معاہدوں کو منسوخ کرتے تھے تو منسوخی کے اعلان کے لیے تیار کردہ تحریر پر بسم اللہ نہیں لکھتے تھے۔ سورۂ توبہ میں بھی مشرکین سے کیے گئے معاہدے کی منسوخی کا اعلان ہے، اس لیے اس کا آغاز بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے نہیں کیا گیا اور جب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو بھیجا کہ حج کے موقع پر ان آیات کو علی الاعلان سنا دیں تو انھوں نے بھی شروع میں بسم اللہ نہیں پڑھی۔

ایک دوسرا قول انھوں نے حضرت علیؓ سے نقل کیا ہے کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اصلاً امان اور

رحمت کا مظہر ہے، جب کہ اس سورت سے اللہ تعالیٰ کی ناراضی اور غضب کا اظہار ہوتا ہے (تفسیر قرطبی، طبع مصر، ۱۹۸۷ء، ۸/۶۳)۔ لیکن اس تاویل کو علامہ آلوسی نے ضعیف بتایا ہے۔ اس لیے کہ بعض دیگر سورتوں، مثلاً مطففین، ہمزہ اور لہب وغیرہ کا آغاز بھی اللہ کے غضب سے ہوا ہے، مگر ان کے شروع میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھی جاتی ہے۔ (روح المعانی، طبع مصر، ۱/۴۱)

اس سلسلے میں قولِ فیصل وہی ہے جسے علامہ قرطبیؒ نے امام قشیریؒ کے واسطے سے نقل کیا ہے: ''صحیح بات یہ ہے کہ یہاں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اس لیے نہیں لکھی جاتی کیوں کہ حضرت جبرئیلؑ جو قرآن لے کر نازل ہوئے تھے، اس میں یہاں وہ نہیں تھی''۔ (تفسیر قرطبی، ۸/۶۳)

یہ تو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نہ لکھے جانے کی بات ہے۔ جہاں تک اس کے پڑھنے یا نہ پڑھنے کا معاملہ ہے، تو اس سلسلے میں علما فرماتے ہیں کہ چوں کہ یہاں وہ لکھی ہوئی نہیں ہے، اس لیے اسے پڑھنا بھی نہیں چاہیے۔ لیکن بعض علما اس کے پڑھنے کی اجازت دیتے ہیں۔ اس موضوع پر علامہ آلوسی نے کسی قدر تفصیل سے لکھا ہے، جسے نقل کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ وہ امام سخاویؒ کے حوالے سے فرماتے ہیں: ''مشہور ہے کہ سورۂ توبہ کے شروع میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نہ پڑھی جائے۔ عاصمؒ سے مروی ہے کہ پڑھنی چاہیے۔ یہ بات انھوں نے قیاساً کہی ہے۔ کیوں کہ اس کے لکھے نہ جانے کا سبب یا تو یہ ہے کہ اس میں مشرکینِ مکہ سے جنگ کی بات کہی گئی ہے یا یہ ہے کہ صحابہ قطعی طور پر طے نہیں کر پائے تھے کہ یہ مستقل سورت ہے یا سورۂ انفال کا حصہ ہے۔ پہلی صورت میں اس کا حکم ان لوگوں کے ساتھ خاص ہوگا جن کے بارے میں یہ سورت اُتری تھی اور ہم تو اسے برکت حاصل کرنے کے لیے پڑھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر ان آیتوں سے قرآن پڑھنے کا آغاز کیا جائے جن میں مشرکین سے جنگ کرنے کا حکم ہے تو ان سے پہلے بسم اللہ پڑھنا بالاتفاق جائز ہے۔ دوسری صورت میں بھی بسم اللہ پڑھی جاسکتی ہے جس طرح سورتوں کے شروع میں بسم اللہ پڑھنی چاہیے۔ روایت میں ہے کہ مصحفِ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے شروع میں وہ لکھی ہوئی تھی''۔ (روح المعانی، ۱۰/۴۲)

علامہ آلوسیؒ مزید فرماتے ہیں: ''ابن منادر کی رائے ہے کہ بسم اللہ (سورۂ توبہ کے شروع میں) پڑھنی چاہیے۔ الاقناع میں بھی اس کے جواز کی بات کہی گئی ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ اسے

نہ پڑھنا مستحب ہے، اس لیے کہ مصحف میں وہ درج نہیں ہے اور اس معاملے میں کسی دوسرے کی تقلید نہیں کی جائے گی۔ لیکن اس جگہ بسم اللہ پڑھنے کو حرام قرار دینا اور نہ پڑھنے کو واجب کہنا، جیسا کہ بعض مشائخ شافعیہ کا خیال ہے، تو ظاہر ہے کہ یہ بات صحیح نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جو شخص درمیانِ سورہ سے تلاوت شروع کرے، اس کے لیے بسم اللہ پڑھنے میں کوئی حرج نہیں ہے واللہ تعالیٰ اعلم''۔(روح المعانی،۱۰/۴۲)

اس موضوع پر مولانا مفتی محمد شفیع عثمانیؒ نے اپنی تفسیر میں صحیح رہ نمائی کی ہے: ''حضرات فقہا نے فرمایا ہے کہ جو شخص اُوپر سے سورۂ انفال کی تلاوت کرتا آیا ہو اور سورۂ توبہ شروع کر رہا ہو وہ بسم اللہ نہ پڑھے، لیکن جو شخص اس سورت کے شروع یا درمیان سے اپنی تلاوت شروع کر رہا ہے، اس کو چاہیے کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ کر شروع کرے۔ بعض ناواقف یہ سمجھتے ہیں کہ سورۂ توبہ کی تلاوت میں کسی حال میں بسم اللہ پڑھنا جائز نہیں۔ یہ غلط ہے اور اس پر دوسری غلطی یہ ہے کہ بجاے بسم اللہ کے، یہ لوگ اس کے شروع میں اعوذ باللّٰہ من النار پڑھتے ہیں، جس کا کوئی ثبوت آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ سے نہیں ہے'' (معارف القرآن، طبع دیوبند،۴/۷۷)۔ (رضی الاسلام ندوی، زندگی نو، نئی دہلی، مئی ۲۰۱۱ء)

ناقص الخلقت جنین کا اسقاط

س: ایسا ناقص الخلقت جنین، جس کے بارے میں الٹرا ساؤنڈ سے یقین ہوگیا ہو کہ وہ پیدا ہوگا تو مختصر عرصے میں مرجائے گا یا زندہ رہے گا تو معمول کی زندگی نہیں گزار سکے گا۔ کیا اس کا اسقاط کرانا جائز ہے؟

ج: اسلامی شریعت نے جنین کو وہی حیثیت دی ہے جو زندہ انسان کی ہوتی ہے۔ اسی لیے اس نے ان تمام صورتوں کو ممنوع قرار دیا ہے جن سے جنین کو ضرر لاحق ہوسکتا ہے۔ اگر جنین کو کسی قسم کا خطرہ ہو تو حاملہ یا مرضعہ (دودھ پلانے والی) عورت کو رمضان کے روزے نہ رکھنے کا حکم ہے۔ اسی طرح اس پر حد جاری نہیں کی جاسکتی، جب تک کہ وہ بچے کو جنم نہ دے لے اور وہ دودھ چھڑانے کی عمر کو نہ پہنچ جائے۔

اسی بنا پر علما نے روح پھونکے جانے کی مدت کے بعد اسقاط کو ناجائز قرار دیا ہے۔ یہ

مدت بخاری و مسلم کی ایک حدیث کے مطابق ۱۲۰ دن ہے۔ اس سے قبل اس کے جواز یا عدم جواز کے سلسلے میں ان کا اختلاف ہے۔ بعض علما کے نزدیک بہ وقتِ ضرورت جائز ہے۔ کیوں کہ روح پھونکے جانے سے قبل جنین محض ایک بے جان لوتھڑا ہے، لیکن بعض علما اس وقت بھی اسقاط کو حرام نہیں تو مکروہ ضرور قرار دیتے ہیں۔ اس لیے کہ اگر اسے چھوڑ دیا جائے تو آیندہ اس میں روح پڑ جائے گی۔

بعض علما کے نزدیک روح پھونکے جانے کی مدت کے بعد بھی ناگزیر حالت میں اسقاط کروایا جاسکتا ہے۔ یہ ناگزیر صورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ جنین میں کوئی ایسا تخلیقی نقص پیدا ہوجائے کہ پیدا ہونے کے بعد اس کی زندگی اجیرن ہوجائے۔ الٹراساؤنڈ سے ایسے نقائص کا پتا لگ جاتا ہے۔ علامہ یوسف القرضاوی نے ایک سوال کے جواب میں اس موضوع پر تفصیل سے لکھا ہے اور ان علما کی راے سے اپنے اختلاف کا اظہار کرتے ہوئے بعض دلائل دیے ہیں۔

آخر میں لکھا ہے: ''میری نظر میں صرف ایک ہی ایسی صورت ہے جس میں اسقاط کی اجازت دی جاسکتی ہے۔ وہ یہ کہ اسقاط نہ کرایا گیا تو ماں کی جان کو خطرہ لاحق ہوجائے۔ ایسی صورت میں ماں کی جان بچانے کے لیے حمل کو ساقط کرایا جاسکتا ہے۔ کیوں کہ ماں کی جان بہرحال بچے کی جان سے زیادہ اہم ہے (فتاویٰ یوسف القرضاوی، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی، جلد دوم، ص ۲۲۵)۔ (رضی الاسلام ندوی، زندگی نو، نئی دہلی، مئی ۲۰۱۱ء)

وسوسوں پر مواخذہ

س: بعض اوقات انسان کے ذہن میں عجیب وغریب قسم کے سوالات و وسوسے آنے لگتے ہیں، کیا ان وسوسوں پر مواخذہ کیا جائے گا؟

ج: دل میں خیالات و وساوس کا آنا خاصۂ انسانی ہے۔ نماز کے دوران اگر وسوسے آئیں تو کوشش کر کے انھیں جھٹک دینا چاہیے۔ عام حالات میں بھی وسوسے مطلوب نہیں لیکن بہرحال یہ انسانی کمزوری ہے۔ اسی لیے نبی رؤف ورحیم نے امت کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ اللہ رب العالمین نے اپنی رحمت خاص سے میری امت پر سے دل میں گزرنے والے خیالات و

وساوس پر مواخذہ نہ کرنے کی بشارت دی ہے، جب تک کہ اس وسوسے کو زبان پر نہ لایا جائے اور نہ اس کے مطابق کوئی عمل ہی کیا جائے۔ صحیح حدیث میں یہ بھی ثابت ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریمؐ سے صحابہؓ نے یہ سوال کیا کہ ان کے دل میں خیالات و وسوسے آتے ہیں، تو آپؐ نے فرمایا کہ ہاں یہ وسوسے آنے کا عمل انسانی کمزوری ہے۔ یہ عمل بعض اوقات انسان کو اس مقام پر لے آتا ہے کہ وہ سوچتا ہے ساری مخلوق کو اللہ نے پیدا کیا ہے تو اللہ کو کس نے پیدا کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا جب ایسا خیال ذہن میں آئے تو سمجھو کہ یہ شیطان ہے۔ اس لیے وسوسوں کو ذہن سے فوراً جھٹک کر یہ کہیے: امنت باللّٰہ و رسلہ۔ ایک دوسری روایت میں آں حضورؐ نے فرمایا: ایسی کیفیت میں انسان کو شیطان سے اللہ کی پناہ مانگنی چاہیے اور ان خیالات کو یکسر ترک کرنا چاہیے (مسلم)۔ واللّٰہ اعلم بالصواب۔ (شیخ عبدالعزیز بن بازؒ، ترجمہ: حافظ محمد ادریس، المجتمع، کویت، شمارہ ۱۹۵۳، ۲۱ مئی ۲۰۱۱ء)

قرآن کو چومنا

س: قرآن مجید اگر غلطی سے ہاتھ سے گر جائے تو اس کا کیا کفارہ ہے، اور کیا ایسی صورت میں اسے چوم کر اونچی جگہ پر رکھنا چاہیے؟

ج: صحابی جلیل حضرت عکرمہؓ بن ابی جہل کے بارے میں یہ روایت بیان کی گئی ہے کہ وہ مصحف شریف کی تلاوت کرتے ہوئے اسے چوما کرتے تھے اور ساتھ کہا کرتے تھے کہ یہ میرے رب کریم کا عظیم الشان کلام ہے۔ اس لیے قرآن مجید کو چومنے میں کوئی حرج نہیں مگر قرآن مجید غلطی سے نیچے گر جائے تو اس پر کوئی کفارہ نہیں۔ اسی طرح یہ بات بھی سامنے رہنی چاہیے کہ قرآن مجید کو چومنا واجباتِ شرعیہ میں سے بھی نہیں ہے۔ پس قرآن مجید کی عظمت کے پیش نظر گر جانے کی صورت میں یا اس کے بغیر بھی قرآن کو عقیدت و محبت سے چوما جائے تو ہمارے نزدیک اس میں کوئی حرج کی بات نہیں۔ (ایضاً)


نورس
SINCE 1979
SUNDiP
Naturally Better
Jams, Ketchup,
Pickles, Squashes,
Marmalade,
Chicken Spread....
SUNDiP
MANGO
Squash
SUNDiP
TOMATO
Ketchup
PREMIUM QUALITY
500g
Net Weight
SUNDiP
MIXED
Pickle in Oil
SUNDiP
APPLE Jam
نورس
Naurus NATIONAL DRINK
Quality Product of Naurus (Pvt.) Ltd.

کتاب نما

تحقیقاتِ اسلامی کے فقہی مباحث، مولانا سید جلال الدین عمری۔ ناشر: اسلامک ریسرچ اکیڈمی، کراچی۔ تقسیم کنندہ: اکیڈمی بک سنٹر (A.B.C)، ۳۵-ڈی، بلاک ۵، فیڈرل بی ایریا، کراچی۔ ۷۵۹۵۰۔ فون: ۳۶۸۰۹۲۰۱-۰۲۱۔ صفحات: ۱۷۰۔ قیمت: ۱۵۰ روپے۔

سیاسی اور بین الاقوامی مسائل پر اسلام کی رہنمائی زیادہ تر اصولی ہدایات پر مبنی ہے۔ اس کی تفصیلات سے بہت زیادہ بحث نہیں کی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے مسائل کے بارے میں ہمارے فقہی ذخیرے میں آرا کا ایک تنوع موجود ہے۔ گویا یہ مسائل ہر عہد کے اہلِ اسلام کو اسلام کی فراہم کردہ اصولی ہدایات کی روشنی میں خود حل کرنے ہوں گے جس کی مثالیں فقہا کی آرا کی صورت میں موجود ہیں۔ 'فقہی مباحث' میں بعض ایسے ہی اہم اور نازک مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ آٹھ عنوانات میں منقسم یہ کتاب بہت جامعیت کے ساتھ اسلامی شریعت میں اجتہاد کے عمل، دارالاسلام اور دارالحرب کا تصور (جدید عالمی تناظر میں)، اسلامی ریاست میں غیر مسلموں پر اسلامی قانون اور حدود کا نفاذ، غیر مسلموں سے ازدواجی تعلقات، اسلام کا قانونِ قصاص و دیت اور قذف و لعان کے احکام پر بھرپور رہنمائی فراہم کرتی ہے۔

کتاب کی یہ خوبی خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہے کہ مصنف نے ذاتی تبصرے کا دخل بہت کم رکھا ہے۔ قرآن و حدیث کے نصوص اور فقہاے اسلام کی آرا ہی سے موضوع پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اگرچہ فقہی مباحث کے مسائل خالص فقہی نوعیت کے ہیں مگر جامع علمی اسلوب کی بنا پر عام فہم انداز میں سامنے آتے ہیں۔ غیر مسلم ممالک میں مقیم مسلمانوں اور مسلم ممالک میں مقیم غیر مسلموں کے لیے اسلامی شریعت نے جو رہنمائی فراہم کی ہے، اُردو قارئین کے لیے اس سے استفادے کی ایک صورت اس کتاب کا مطالعہ ہوسکتی ہے۔ مصنف نے انکسار کے ساتھ اس بات کا اظہار کیا ہے

کہ’’ ان مسائل کی نوعیت ایک طالب علم کے قلم سے زیربحث موضوعات کے تعارف اور ان پر اظہارِ خیال کی ہے۔ یہ کسی فرد یا ادارے کی ترجمانی نہیں ہے‘‘۔(ص ۹)

مجلہ تحقیقاتِ اسلامی میں شائع شدہ مزید ایسے علمی و فقہی ذخیرے کو کتابی صورت میں شائع کرنے کی ضرورت ہے۔ بایں ہمہ زیرنظر کتاب کسی محقق و عالم کی بنیادی ضرورت کو بھی بخوبی پورا کرتی ہے۔(ارشاد الرحمٰن)

جوّدِ القرآن، مؤلفہ: شاہدہ قاری۔ ملنے کا پتا: علوم القرآن انسٹی ٹیوٹ براے خواتین، ۱۶۹-بی، بلاک نمبر۱۱، گلستانِ جوہر، کراچی۔ فون: ۲۹۵۹۹۱۲-۰۳۲۱۔ صفحات: ۳۵۴۔ قیمت: ۷۵۰ روپے۔

تجوید جیسے فنی موضوع پر ایک خاتون کی جانب سے اتنی عمدہ معیاری کتاب مسلمان خواتین کی درخشاں علمی روایت کا تسلسل ہے۔ اس کتاب کی مؤلفہ شاہدہ قاری نے اس سے قبل فضیلتِ قرآن اور قواعد فنِ تجوید کے نام سے بھی کتابیں لکھی ہیں۔

جوّدِ القرآن ۱۰ ابواب پر مشتمل بڑے سائز کی ضخیم مجلّد کتاب ہے جس میں علم التجوید کے مشکل مباحث کو نہایت سلیس انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ پہلا طویل باب ’تعارف قرآنِ مجید‘ (۷۲ صفحات) ایک منفرد کاوش قرار دیا جاسکتا ہے۔ متعلقہ احادیث ترجمہ اور قابلِ توجہ نکات کے ساتھ، آدابِ قرآن، آدابِ تلاوت، حقِ قرآن (عمل پر تاکید) تجوید، ترتیل، عیوبِ تلاوت، معلومات، جمع قرآن، قراے سابعہ اور ان کے راویوں کے حالات، اس میں سب ہی کچھ ہے۔ بعد کے آٹھ ابواب میں حروف کے مخارج اور صفات کی پہچان کے لیے نقشوں، چارٹس اور تصاویر سے مدد لی گئی ہے۔ مختلف رنگوں کے استعمال سے تفہیم کا انداز مزید سہل بنا دیا گیا ہے۔ ایسے وقت میں کہ ملک میں تجوید کے ساتھ قراءت کرنے کا مبارک رجحان روز افزوں ہے، اس طرح کی دل کش کتابیں ایک بڑی ضرورت کو پورا کرتی ہیں۔ یہ کتاب دینی مدارس اور عصری تعلیمی اداروں کے طلبہ و طالبات کے لیے انتہائی مفید ہے۔ کتاب کی ترتیب اس طرح ہے کہ اسے نصاب کے طور پر بھی پڑھایا جاسکتا ہے۔ اپنے شوق سے تجوید سیکھنے والے افراد بھی اس سے استفادہ کرسکتے ہیں۔ اگر قرآن انسٹی ٹیوٹ اس کا آڈیو وڈیو کیسٹ تیار کردے تو کیا کہنا۔ طباعت اور پیش کش کا معیار اعلیٰ ہے۔(حافظ ساجد انور)

ماہنامہ **افکارِ ملّی**، دہلی (خصوصی اشاعت: سیرت محمدؐ اور عصر حاضر)، مدیر: ڈاکٹر قاسم رسول الیاس۔ ۹/۲۳۲، ذاکر نگر، جامعہ نگر، نئی دہلی- ۱۱۰۰۲۵، بھارت۔ فون: ۹۸۱۱۸۲۸۴۴۴-۹۱۔ صفحات: ۲۴۰۔ قیمت: ۲۰۰ روپے بھارتی۔

سیرتِ رسولؐ ایک نہ ختم ہونے والا موضوع ہے۔ روایتی مضامین اور کتب شائع ہوتی ہیں، ان کی اپنی کشش اور ضرورت ہے۔ لیکن کبھی غیر روایتی پیش کش بھی سامنے آجاتی ہے۔ زیر تبصرہ خصوصی اشاعت اسی زمرے سے ہے۔

یہ کہا تو جاتا ہے کہ سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں آج کے دور کے انسان کی زندگی کے ہر طرح کے مسائل کا حل ہے لیکن اس حوالے سے مسائل کا تعین کر کے خصوصی مطالعے پیش کرنا اور وہ بھی یک جا، ایسا کام ہے جس کی تحسین نہ کرنا زیادتی ہوگا۔

اس خصوصی اشاعت کو نو ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے، مثلاً شخصی ارتقا، لائف اسٹائل، سماج کے کمزور طبقات، عالمی مسائل، تمدنی مسائل، معاشی اور معاشرتی مسائل۔ ان کے تحت ۴۹ مقالات پیش کیے گئے ہیں۔ چند عنوانات یہ ہیں: انسانی وسائل کا فروغ، صارفین کا مسئلہ، مالیاتی بحران، آرٹ کلچر اور تفریحات، خواتین کے مسائل، معذوروں کا مقام، جنگی اخلاقیات، جنگی قیدی، ماحولیاتی بحران، وطن پرستی، حقوق انسانی، فحاشی و عریانی، معاشی پس ماندگی، urbanisation (شہر کاری) بین المذاہب ڈائیلاگ وغیرہ۔ کئی مقالات عمومی نوعیت کے ہیں۔ لکھنے والوں میں مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، ڈاکٹر محمد رفعت، رضی الاسلام ندوی، یٰسین مظہر صدیقی، پروفیسر عبدالواسع اور بہت سے دوسرے شامل ہیں۔ یہ اشاعت معنوی اعتبار سے وقیع اور دستاویزی ہونے کے ساتھ ساتھ ظاہری طور پر دیدہ زیب اور دل کش ہے۔ (مسلم سجاد)

مکہ میں نیا جنم، جنید ثاقب۔ ناشر: الیسکام کمپیوٹر اینڈ پرنٹرز، فیصل پلازا، نزد گلزار سوئچ بورڈ، دیپال پور روڈ، اوکاڑا۔ صفحات: ۱۴۴۔ قیمت: ۲۰۰ روپے۔

جنید ثاقب ۲۰۰۸ء میں شدید بیمار ہوگئے۔ کہتے ہیں یوں لگا کہ میرا سفر زندگی تمام ہوا، مجھے شدید پچھتاوا ہوا کہ استطاعت کے باوجود حج نہیں کرسکا۔ اب اگر میں اس دنیا سے رخصت ہوتا

ہوں تو اپنے رب کے سامنے کیا منہ لے کر جاؤں گا (ص ۱۳)۔ یہی پچھتاوا ان کے لیے سفرِ حج کا محرّک بن گیا۔ چنانچہ ۲۰۰۹ء کے سفرِ حج کی روداد انھوں نے اپنے استاد (پروفیسر محمد اکرم طاہر) کے شوق دلانے پر لکھ ڈالی۔ طاہر صاحب نے 'پیش لفظ' میں اسے 'حج کے سفرناموں میں ایک نہایت قابلِ قدر اضافہ' قرار دیا ہے (ص ۹)۔ (اضافہ ہے یا نہیں؟ اس کا فیصلہ تاریخِ ادب کرے گی مگر) سفرنامہ دل چسپ ضرور ہے۔

حج اور عمرے کے بیش تر معاصر سفرناموں میں جو کچھ ہوتا ہے، مثلاً جدہ کیسے پہنچے؟ ہوائی اڈے پر حجاج سے کیا سلوک ہوا؟ مکہ پہنچنے میں غیرمعمولی تاخیر، معلّم کی بے حسی، وزارتِ مذہبی امور کی بے نیازی، حرم سے قیام گاہوں کی دُوری، طواف کی لذت، مِنٰی اور عرفات کی سختیاں اور پریشانیاں، شیطانوں پر کنکرزنی، اپنے خیمے کا راستہ بھولنا، طوافِ وداع میں غیرمعمولی ہجوم وغیرہ، غرض سفرِ حج کی تمام آزمایشوں کا ذکر اس سفرنامے میں بھی موجود ہے لیکن اس کے چند پہلو قاری کو متاثر کرتے ہیں، مثلاً زائر کی صاف گوئی، حرم میں زیادہ سے زیادہ وقت گزار کر، 'نیکیاں کمانے' کی معصومانہ خواہش (جس پر جنید ثاقب نے دوستوں کے ساتھ جدہ جانے کا پروگرام بھی قربان کر دیا) (ص ۶۳)۔ اسی طرح حرمین کے مختلف مقامات کی یادیں جوان کی رومانوی افتادِ طبع سے چمٹ کر بار بار تازہ ہوتی ہیں۔ اسی طرح اتباعِ سنت کی قابلِ تعریف کوشش۔ (ص ۸۴)

نام مکّہ میں نیا جنم اس لحاظ سے معنی خیز ہے کہ اس سفر میں جنید ثاقب کو دو اعتبار سے نئی زندگی ملی۔ اوّل اس لحاظ سے کہ حج قبول ہوا (تو حقوق العباد کو چھوڑ کر) زائر نے گناہوں سے پاک وصاف ہو کر گویا 'نیا جنم' لیا۔ دوم: روزِ عرفات انھیں جسمانی طور پر بھی نئی زندگی عطا ہوئی۔ وہ موت کے بہت قریب پہنچ کر بچ نکلے۔ مسجد نمرہ سے نکلتے ہوئے ایک بھگدڑ کی زد میں آ گئے تھے۔ کہتے ہیں کہ میرے اللہ نے مجھے ''اُس بھیڑ اور خوف ناک بھگدڑ سے نکال دیا جس میں گیارہ لوگ شہید ہوئے اور لاتعداد زخمی۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں کیسے وہاں سے نکل آیا؟'' (ص ۴۷)۔ بارھویں یہ بھی ہو سکتے تھے، اس لیے واقعی یہ ان کا 'نیا جنم' تھا۔ تین صفحات پر مشتمل مسجد نمرہ پہنچنے اور وہاں سے نکلنے کی اس روداد میں افسانے کا سا تحیّر (suspense) ہے۔ اسی طرح کے افسانوی بیانات سفرنامے کے بعض دوسرے حصوں میں بھی ملتے ہیں، مثلاً مدینہ منورہ میں ان کی

بیلٹ کسی تیز دھار آلے سے کاٹی گئی۔ بیلٹ میں واپسی کی ہوائی ٹکٹ، پاسپورٹ کی نقل اور دو ہزار ریال تھے مگر ''خدا نے میری جان اور مال دونوں کو محفوظ رکھا، مجھے بچالیا گیا''۔ (ص ۱۱۴)

بیش تر نئے قلم کاروں کی طرح جنید ثاقب کے ہاں بھی زبان و بیان کی خامیاں موجود ہیں۔ سب سے تکلیف دہ انگریزی لفظوں کا بلاضرورت استعمال ہے اور اس طرح کے جملے ہیں: 'فاسٹ فوڈ کے ہوٹلز کی ایک چین ہے'' یا ''فاسٹ فوڈ کھانے کا موڈ ہوتا'' (ص ۳۷)۔ کیا اُردو زبان کی آلودگی میں اضافہ کرنے والے انگریزی الفاظ کی جگہ اُردو میں موجود متبادل الفاظ استعمال نہیں کیے جاسکتے؟ براہ کرم 'انگریزیت' سے بچنے کی شعوری کوشش کیجیے۔ (رفیع الدین ہاشمی)

درس و عبرت، آبادشاہ پوری، نظرثانی: محسن فارانی۔ ناشر: دارالابلاغ پبلشرز، رحمان مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور۔ فون: ۳۷۳۶۱۴۲۸-۰۴۲۔ صفحات: ۱۱۲۔ قیمت: درج نہیں۔

تاریخ جہاں مختلف واقعات و حوادث کا مرقع ہے وہیں پر مردانِ بے باک و جری کے تذکرۂ جانفزا کا نام ہے ___ تاریخ دراصل قوموں کے حافظے کا نام ہے جس سے قومیں اپنے مستقبل کا لائحہ عمل متعین کرتی اور آگے بڑھنے کا موقع پاتی ہیں۔

تاریخِ اسلام میں اپنی جدوجہد اور معرکہ آرائی کے اَنمٹ نقوش ثبت کرجانے والے چار مردانِ ذی وقار کا خوب صورت اور ایمان افروز تذکرہ درس و عبرت کے عنوان سے (جو مناسبت نہیں رکھتا) محسن فارانی نے ترتیب دیا ہے جن میں امیر عبدالقادر جزائریؒ، مہدی سوڈانیؒ، غازی انور پاشاؒ اور عمر مختار السوسی کے دل چسپ تذکرے شامل ہیں۔

سید بادشاہ کے مصنف آبادشاہ پوری نے عالمِ اسلام کی ان چار افسانوی شخصیات کا احوال شگفتہ طرزِ تحریر اور جذبۂ ایمانی کے ساتھ رقم کیا ہے۔ مزاحمت کی علامت سمجھی جانے والی تاریخِ اسلام کی ان بلند پایہ اور بلند قامت شخصیات پر طبع ہونے والے یہ مضامین جہاں ان کے کارناموں کو اُجاگر کرتے ہیں وہیں فرانسیسی، روسی، برطانوی اور اطالوی سازشوں، ریشہ دوانیوں، وحشت ناک مظالم اور دہرے معیارات کا پردہ چاک کرتے نظر آتے ہیں۔ موجودہ صدی میں اہلِ مغرب بالخصوص امریکا اور یورپ کی مرضی سے عالمِ اسلام کے ساتھ روا رکھا جانے والا سلوک اور اس کا پس منظر سمجھنے میں یہ مختصر کتاب ایک اچھا موقع فراہم کرتی ہے۔ آج ہم کو سوپر پاور سے

ڈرانے والے دیکھیں کہ ان مجاہدوں سے سوپر پاور ڈرا کرتی تھیں۔ ان نوجوانوں کے لیے جنھیں پاکستان کا مستقبل تعمیر کرنا ہے، یہ کتاب ایک دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔(عمران ظہور غازی)

روزمرہ آداب، پروفیسر ارشد جاوید۔ علم وعرفان پبلشرز، الحمد مارکیٹ، ۴۰- اُردو بازار، لاہور۔ فون: ۳۷۳۵۲۳۳۲-۰۴۲۔ صفحات: ۹۶۔ قیمت: ۱۰۰ روپے۔

ایک عام سے موضوع پر بظاہر ایک عام سی کتاب ہے لیکن ہاتھ میں لے کر ورق گردانی کریں تو محسوس ہوگا کہ پروفیسر ارشد جاوید صاحب نے ۱۰۰ سے بھی کم صفحات میں ۲۱ عنوانات کے تحت ایک خزانہ جمع کر دیا ہے۔ بڑوں کا خیال ہوتا ہے کہ آداب سیکھنا بچوں کا کام ہے، بڑوں کو اس سے کیا کام! لیکن جیسا کہ سرورق پر لکھا گیا ہے کہ یہ ''ہر پاکستانی کے لیے ضروری'' ہے۔ پاکستانی لکھ کر مصنف نے تکلف سے کام لیا ہے۔ یہ ہر اُردو پڑھنے والے کے لیے ہے اور دیگر زبانوں میں ترجمہ ہو جائے تو ان زبانوں کے قارئین کے لیے بھی___ مسلمان ہونے کی بھی شرط نہیں، اس لیے کہ یہ آداب کسی بھی انسانی معاشرے کو شائستگی، باہمی احترام اور سکون دے سکتے ہیں۔ پہلے باب میں اخلاقی آداب کے حوالے سے اخلاقی خوبیوں اور خرابیوں پر سب سے طویل تحریر ہے۔ جھوٹ، ایمان داری، قَسم، وعدہ، معاہدہ، غیبت، چغلی، بدگمانی، مذاق اُڑانا، طعنہ زنی، فحش گوئی، لڑائی جھگڑا، نرم مزاجی، چوری اور غصہ کے عنوانات سے آپ اس کی جامعیت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اس کے بعد سونے جاگنے کے، کھانے پینے کے، لباس کے، مجلس کے، سفر کے، ٹریفک کے، حتیٰ کہ جنازے کے آداب، نیز صفائی اور پاکیزگی، صحت، شکرگزاری، پھر پڑوسی کے حقوق، راستے کے حقوق، والدین کے حقوق، ہر ایک پر اختصار لیکن جامعیت سے گفتگو کی گئی ہے اور آج کے حالات کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔ آخری خوب صورت باب دعاؤں کے موضوع پر ہے۔ ابتدائی ضروری گفتگو کے بعد خاص موقعوں کی دعائیں ترجمے کے ساتھ درج کر دی گئی ہیں۔

یہ مختصر کتاب ہر گھر کی ضرورت ہے۔ ہر بچے اور بڑے کی ضرورت ہے۔ اس کے ابواب رسائل میں بطور مضمون شائع ہو سکتے ہیں۔ بچوں کے رسائل تو باری باری سب کچھ نقل کر سکتے ہیں۔ کوئی کمی نہ بتائی جائے تو تبصرہ مکمل نہیں ہوتا۔ اگر ٹیلی فون کے آداب، انٹرنیٹ اور

ای میل کے آداب اور فیس بک کے آداب پر بھی ابواب ہوتے تو یہ کتاب زمانے کے تقاضوں کو پورا کرتی (اب بھی کرتی ہے)۔ ان مشاغل میں بڑے اور بچے اپنا بہت زیادہ وقت صَرف کر رہے ہیں۔ اس بارے میں انھیں کچھ آداب سکھانے کی ضرورت ہے۔ واضح رہے کہ یہ آداب پر روایتی کتاب نہیں، قرآن اور حدیث پر ضرور مبنی ہے لیکن عملی اِطلاق میں کارگر نکات نے اسے ایک عام کتاب نہیں بلکہ جیسا کہ ابتدا میں کہا گیا ایک غیر معمولی کتاب بنا دیا ہے۔ اگر ہمارا معاشرہ خواندہ اور زندہ معاشرہ ہوتا تو ایسی کتاب چند دنوں میں ایک ملین فروخت ہوتی۔ (م- س)

مزدور تحریک، مزدور مسائل اور سید مودودی، پروفیسر محمد شفیع ملک۔ ناشر: پاکستان ورکرز ٹریننگ ٹرسٹ، ایس ٹی ۲/۳، بلاک ۵ گلشن اقبال، کراچی۔ فون: ۳۴۸۱۸۴۴۹-۰۲۱۔ صفحات: ۲۰۰۔ قیمت: ۲۰۰ روپے۔

اسلام ایمان وعمل ہے اور تحریک وتہذیب بھی۔ اس مناسبت سے وہ انسانی زندگی کے تمام شعبوں سے تعلّق رکھتا ہے اور ان کی مثبت تشکیل کا فریضہ بھی انجام دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے اسلام صرف مسجد اور عبادت گاہوں کا دین نہیں بلکہ وہ کھیتوں، کھلیانوں، صنعت گاہوں اور ایوانِ اقتدار کے باسیوں سے بھی مخاطب ہوتا ہے۔ انقلابِ فرانس کے بعد جوں ہی صنعتی انقلاب کے دائرے میں وسعت آئی، تو سرمایے کا چند ہاتھوں میں ارتکاز ہوا اور انسانی محنت ومشقت کا استحصال اپنی انتہاؤں کو چھونے لگا۔ یہی کچھ ہمارے سماج میں بھی ہوا۔

سید مودودی علیہ الرحمہ نے جب معاشرے کو خطاب کیا تو ان میں ایک مظلوم ترین طبقہ، پسے ہوئے مزدوروں کی صورت میں سامنے آیا، جس کا خون پسینہ ایک طرف سرمایہ دار نچوڑ رہا تھا تو دوسری جانب اشتراکی مزدور تحریک سرخ انقلاب کے خواب دکھلا کر سودے بازی کر رہی تھی۔ اسی مؤخر الذکر طبقے نے ان کی قیادت پر اجارہ داری بھی قائم کر رکھی تھی۔ تحریکِ اسلامی نے مولانا مودودی کی رہنمائی میں ظلم کی اس دوہری زنجیر کو کاٹنے کے لیے اسلامی مزدور تحریک کا ڈول ڈالا۔ پہلے پہل اسے ایک اجنبی آواز کی طرح سنا گیا، مگر تحریکِ اسلامی سے وابستہ مزدور تحریک کے اَن تھک کارکنوں نے بہ یک وقت ظالم سرمایہ دار اور سرخ پیشہ ور لیڈرشپ، دونوں سے نبردآزما

ہوئے۔ یہ کتاب اس حوالے سے کی جانے والی جدوجہد اور پیش آنے والے اُتار چڑھاؤ کا قیمتی ریکارڈ پیش کرتی ہے اور مولانا مودودی کی معاشی فکر کے بھولے بسرے گوشوں کو بھی نمایاں کرتی ہے۔ کتاب کا دیباچہ محترم سید منور حسن نے تحریر کیا ہے۔(سلیم منصور خالد)

کرنل محمد رشید عباسی، حیات و خدمات، مرتبین: محمد صغیر قمر، عبدالسلام۔ ناشر: ادارہ معارف اسلامی، منصورہ، لاہور۔ صفحات: ۲۰۸۔ قیمت: ۱۸۰ روپے۔

آزاد کشمیر میں جماعت اسلامی ایک بھرپور دینی و سیاسی جماعت کے طور پر اپنا کردار ادا کررہی ہے۔ کرنل محمد رشید عباسی مرحوم نے اس ننھے سے پودے کو تناور درخت میں تبدیل کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ زیرتبصرہ کتاب اسی تفصیل پر مبنی ہے۔

مرتب محمد صغیر قمر کو مرحوم کے قریب رہنے کا وافر موقع ملا اور اُن کا خیال ہے کہ کرنل مرحوم نے آزاد کشمیر کے کونے کونے میں عوام الناس تک تحریکِ اسلامی اور تحریکِ جہاد کا پیغام پہنچایا۔

کرنل محمد رشید عباسی مرحوم ۱۹۸۰ء میں جماعت اسلامی آزاد کشمیر کے امیر بنے اور اپنی تمام صلاحیتیں اپنی دعوت کو پھیلانے میں کھپا دیں۔ یہاں تک کہ ۱۹۸۹ء میں وہ اپنے رب سے جاملے۔ رحلت سے قبل اُنھوں نے ایک بڑی ٹیم ایسے باصلاحیت نوجوانوں کی تیار کردی جنھوں نے غلبۂ اسلام اور استصواب رائے کا علَم بلند رکھا، اور یہ جدوجہد ایک تسلسل سے آج بھی جاری ہے۔

جناب عبدالرشید ترابی، جناب الیف الدین ترابی، جناب حافظ محمد ادریس، جناب یعقوب شاہق کے مضامین خصوصی معلومات کے حامل ہیں۔ دیگر حضرات کے مضامین میں بھی قابلِ قدر معلومات ملتی ہیں۔ دوصد سے زائد صفحات میں مرحوم کے اہلِ خانہ کے علاوہ تحریکِ آزادیِ کشمیر کے اہم رہنماؤں اور اُن کے زیرتربیت رہنے والے کارکنوں کے احساسات کو بھی شاملِ اشاعت کیا گیا ہے۔ کتاب میں آزادی کی جدوجہد کے مختلف مراحل پر کشمیر کا نقشہ اور دیگر تفصیلات پر مبنی مضمون بھی شامل ہوتا تو اس کی قدروقیمت میں مزید اضافہ ہوجاتا۔ عالمی اسلامی تحریکات، تحریکِ آزادیِ کشمیر اور تحریکِ اسلامی کے موضوعات سے دل چسپی رکھنے والے حضرات کے لیے مفید کتاب ہے۔(محمد ایوب منیر)

مدیر کے نام

عبدالرشید عراقی ، سوہدرہ، ضلع گوجرانوالہ

مولانا مودودیؒ نے آج سے ۷۸ سال قبل دین اسلام کی خدمت کے سلسلے میں ترجمان القرآن جاری کیا تھا۔ آپ نے اُن کی باقیات وصالحات کو زندہ رکھنے کا عزم کیا ہے، اللہ تعالیٰ آپ کا حامی و ناصر ہو، آمین! آپ نے عالمی ترجمان القرآن کے نام سے رسالے کا اجرا کر کے مولانا مودودیؒ کی روح کو سکون بہم پہنچایا ہے اور آپ کا یہ اقدام ہر لحاظ سے قابلِ تحسین ہے۔

عبداللّٰہ ،لاہور

الحمدللہ! عالمی ترجمان القرآن کا پہلا شمارہ آ گیا۔ خوشی اس بات کی ہے کہ سید مودودیؒ نے جس مشن کے لیے جماعت اسلامی قائم کی تھی، عالمی ترجمان القرآن اسی مشن کی تکمیل کے لیے کی جانے والی جدوجہد کا ایک تسلسل ہے۔ اللہ تعالیٰ اس رسالے کے ذریعے اس جدوجہد کو جاری رکھے، آمین!

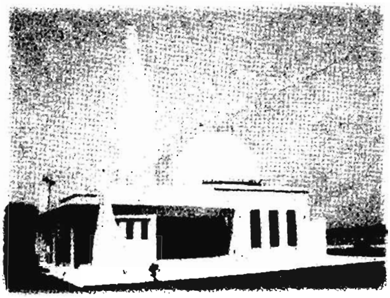
نیا سرورق صوری و معنوی لحاظ سے خوب صورت اور معنی خیز ہے۔ بحیثیت مجموعی پرچہ اچھا ہے۔ تمام مضامین بالخصوص 'امریکی جارحیت: پاکستان کے لیے فیصلہ کن لمحہ' بروقت اور صحیح سمت میں رہنمائی ہے۔ مولانا گوہر رحمان مرحوم کی تحریر: 'نفاذِ شریعت کا راستہ؟' ایک اہم عملی مسئلے پر قرآن وسنت کی روشنی میں مدلل تحریر ہے۔ پروفیسر نجم الدین اربکان فی الواقع ایک تاریخ ساز شخصیت تھے۔ پروفیسر خورشید احمد کی تحریر سے ان کی خدمات اور جدوجہد کی حقیقی تصویر سامنے آئی ہے، اور مخدوش حالات میں جہدِ مسلسل اور اُمید اور حوصلے کا پیغام دیتی ہے۔

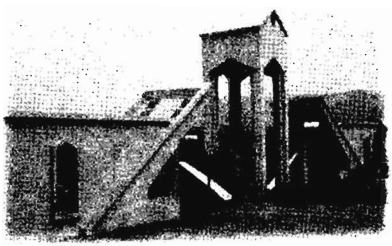
احمد علی محمودی ، حاصل پور

'امریکی جارحیت: پاکستان کے لیے فیصلہ کن لمحہ' (مئی ۲۰۱۱ء) عمدہ تجزیہ و تجاویز ہیں۔ ایبٹ آباد آپریشن کی آڑ میں امریکا نے پاکستان کی آزادی، خودمختاری اور عزت پر حملہ کیا ہے، مگر المیہ یہ ہے کہ ہمارے حکمران اس کھلی جارحیت سے سبق حاصل کرنے کے بجائے دشمنوں کے ہم نوا بنے ہوئے ہیں۔ انھیں ملک وقوم سے کوئی ہمدردی نہیں۔ ان کا ہدف صرف لوٹ مار کرنا ہے۔ ہمارے حکمرانوں نے ذاتی مفاد کے لیے پورے ملک کو داؤ پر لگا دیا ہے، جب کہ دشمن کی نظریں ہماری ایٹمی تنصیبات پر لگی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اب دشمن برملا کہہ رہا ہے کہ پاکستان میں دوبارہ یک طرفہ کارروائی سے گریز نہیں کریں گے۔ دشمن کی یہ دھمکی حکومت کے لیے کھلا چیلنج اور پوری قوم کے لیے لمحۂ فکریہ ہے!

NOC-91/N-1/TP/TMA/FJ

موٹروے سٹی





اگیزیکٹو بلاک (بکنگ جاری)

محل وقوع:

نیو اسلام آباد انٹرنیشنل ایئرپورٹ، جماعت اسلامی کے قرطبہ سٹی، تتازو ڈیم جیسی خوبصورت تفریح گاہ اور مارگلہ دکھیری موورت کی سرسبز وشاداب پہاڑیوں کے وسط میں تعمیرِ ملت ایجوکیشن کے ساتھ واقع ہے۔

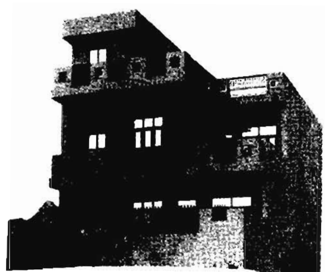
ترقیاتی کام:

سوسائٹی میں مین گیٹ، مسجد اور تین خوبصورت جھیلیں مکمل ہو چکی ہیں۔ 200 کنال پر محیط خوبصورت پارک کی تعمیر جاری ہے اور ماڈل گھروں کی تعمیر مکمل ہو چکی ہے۔ ایک فیز کی پلاننگ مکمل کر کے ممبران کو قبضہ دیئے جا رہے ہیں۔

قطبال ٹاؤن

اسلام آباد

(بکنگ جاری)



محل وقوع: یہ اسلام آباد بائی وے سے 800 گز کے فاصلے پر ٹھنہ ایسٹ میں پہلے سے موجود آباد رہائشی سکیموں کے جھرمٹ میں واقع ہے۔ اسلام آباد بائی وے، لہتراڑ روڈ اور ٹھنہ پل سے قریب ہونے کی وجہ سے 24 گھنٹے ٹرانسپورٹ کی سہولت۔

ترقیاتی کام: یہاں تمام بنیادی سہولیات بجلی، پانی اور گیس، وغیرہ پہلے سے موجود ہیں اس کے علاوہ یہ سکیم انڈر گراونڈ سیوریج اور باؤنڈری وال سے آراستہ ہے۔ یہاں بنیادی سہولیات کی دستیابی و ترقیاتی کام مکمل ہونے کی وجہ سے آپ فوری رہائش رکھ سکتے ہیں، گھروں کی تعمیر کا کام تیزی سے جاری ہے۔

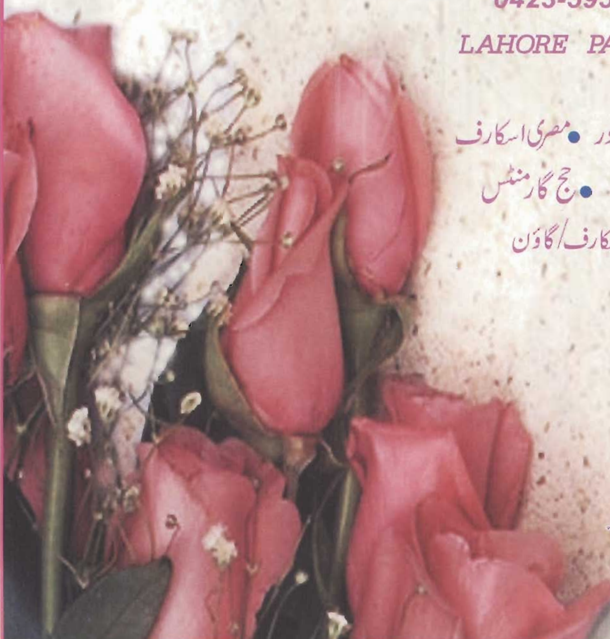
ضرورت نمائندگان:

ملک بھر سے پلاٹوں کی بکنگ کے لیے نمائندوں / کمیشن ایجنٹس کی ضرورت ہے۔ پرکشش کمیشن پیکج دیا جائے گا۔

رابطہ: قاضی انٹرپرائزز 8 جنگ بلڈنگ مری روڈ، راولپنڈی 051-5961923.5961682 U.A.N: 051-111-700-400.

Fax 051-596223[illegible] Email: [illegible]@isb.comsats.net.pk, Web: www.qazigroup.com

مرزا محمد الیاس نے ارقم آفاق پرنٹر، بلال گنج سے چھپوا کر اچھرہ، لاہور سے شائع کیا



C.P.L. 322 **Monthly** AALMI TARJUMAN - UL - QURAN **LAHORE.** Ph: 3758 7916 Fax: 3753 5660